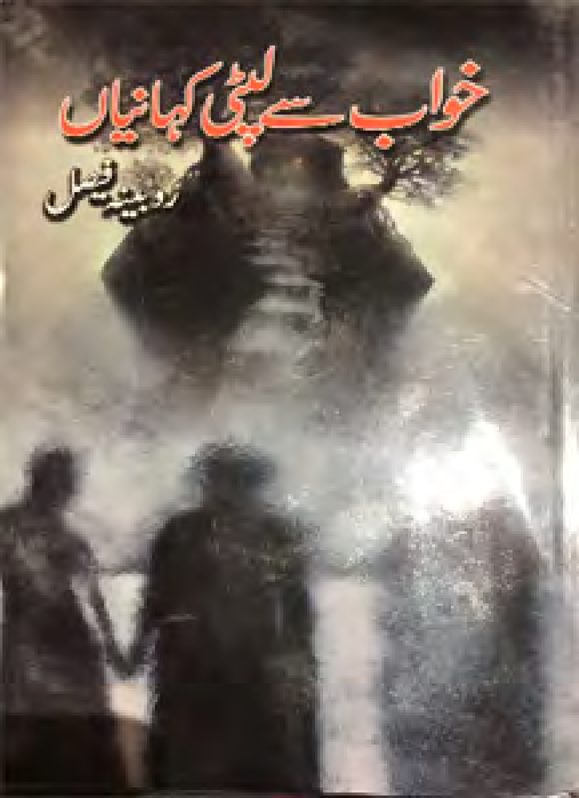

خواب سے لپٹی کہانیاں
روبینہ فیصل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواب سے لپٹی کہانیاں

خواب سے لپٹی کہانیاں

روبینہ فیصل

باذوق لوگوں کے لیے
ہماری کتابیں
خوبصورت کتابیں
تزئین واہتمام اشاعت

خالد شریف

Writer's contact:
rubyfaisal@hotmail.com
Ph: +4168762197

ضابطہ

اشاعت	:	2016
ناشر	:	ماورا پبلشرز، لاہور
طابع	:	شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور
قیمت	:	-/600 روپے
کینیڈا میں	:	20 ڈالر

خوبصورت کتب کی اشاعت کے لیے رابطہ
MAVRA BOOKS
60-The Mall, Lahore.
Ph: 92 42 36303390
Mob: 0300-4020955
e-mail: mavrabooks@yahoo.com

انتساب

سارہ، **ثنا** اور **اقراء** کی ہمت

کے نام

جن کو زندگی کا سفر ماں کی چھاؤں کے بغیر طے

کرنا ہے۔

روبینہ فیصل

ترتیب

افسانے

دیباچہ

ہرانسان کے اندر کہانیاں دبی ہوتی ہیں، ہر کہانی پر ایک کتبہ لگا ہوتا ہے جس پر کردار کا نام کھدا ہوتا ہے، ان کہانیوں کو ان کے کرداروں سمیت قبروں سے نکالنے کے لئے گورکن کی سی بہادری اور ہمت چاہیئے۔ اور کبھی کبھار ایک سے زائد کہانیاں اجتماعی قبر میں آپس میں جپھیاں ڈال کے ایسے بیٹھی ہوتی ہیں، جیسے اون کا الجھا ہوا گولہ۔ اس کی ڈوریوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے انہیں نام دینا، کردار دینا اور سمت دینا، کانٹوں بھرا سفر ہے۔ اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہوجاتی ہے کہ ان اُلجھی ہوئی ڈوروں میں اس کی اپنی زندگی کی ڈور بار بار اُلجھتی جاتی ہے اور کئی دفعہ وہ اپنی ذات کی ڈور کی گتھی سلجھانے میں ایسا اُلجھتا ہے کہ باقی کہانیوں کی ڈور اس کے ہاتھوں سے پھسل کر پھر سے قبر کے اندھیرے میں اُتر جاتی ہے۔ اپنی ذات کو ان کہانیوں سے الگ رکھنا جان جوکھم کا کام ہے مگر جب یہ ہو جاتا ہے تو ایک شاہکار کہانی کا جنم ہوتا ہے۔

میں نے پاکستان اور کینیڈا میں بکھری اپنے ہی لوگوں کی کہانیاں اکٹھی کیں جو کسی نہ کسی طرح میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں اور مجھے اتنا تنگ کرتیں کہ میں راتوں کو سو نہیں پاتی تھی۔ اس کتاب میں شامل کچھ کہانیاں کئی سال پہلے کی لکھی ہوئی ہیں اور کچھ بالکل تازہ ہیں۔

کہانیوں کے اس سفر میں میری اپنی ذات کو درپیش سفر بھی شامل ہے اور یہ سب مل جل کے کیا بنا ہے، میں نہیں جانتی۔ میں نے فقط ایمانداری سے (جو میری ذات کا حصہ

ہے) اس سچ کو چاہے وہ کڑوا ہے یا میٹھا اپنے اندر سے نکال باہر کیا ہے، اب یہ پڑھنے والوں کے سپرد۔

کالم نگاری کے ۱۵ سالوں میں، ان گنت کالم تو لکھ ڈالے مگر زیادہ افسانے نہ لکھ پائی گو کہ افسانہ لکھنا میرے خون میں شامل ہے اور جب کبھی میں سوچتی ہوں کہ خدا مجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہے تو بچپن سے آج تک ایک ہی جواب اندر سے آتا ہے " کہانی لکھوانا چاہتا ہے" ۔ اس کتاب میں شامل 18 افسانے شائد میرے اسی سفر کا آغاز ہیں جس کا بیج قدرت نے میرے اندر رکھ دیا ہے۔

"خواب سے لپٹی کہانیاں" میرا پہلا افسانوی مجموعہ ہے ۔ ان میں محبت ہے، ڈھیروں خواب ہیں، موت ہے، جدائی ہے، بے وفائی ہے اور وقت کی ستم ظریفی ہے۔ یہ موضوع نئے نہیں ہیں لیکن حالات اور کردار نئے ہونے کی وجہ سے، مجھے ہر کہانی نئی لگی ہے۔ میں ڈر کر یا دب کر یا ڈپلومیسی سے نہیں لکھنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے حساس اور بولڈ موضوعات کو بھی چنا ہے، میں نے ایسی باتوں کے مقام پر جا کر بھی دیکھا ہے جہاں جانے سے عام انسانوں کے پر جلتے ہیں۔

زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہادری سے دیکھنے کا ہنر مجھ میں میری امی کی طرف سے آیا ہے۔ میں نے انہیں مشکل سے مشکل حالات میں بھی زندگی کو وقار اور عزت کے ساتھ گزارنے کی تدبیریں نکالتے دیکھا ہے۔ اخبار کی ردی کو جلا کر گھر میں روشنی کرنے اور اسی ردی کو بیچ کر ہمارے لئے پھل منگوانے تک، زندگی کی جنگ میں مردانہ وار لڑنے اور بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے تک، ہمت کی ایک داستان میرے سامنے کھڑی رہی اسی لئے کمزور عورتوں کی کہانیاں لکھنا میرے لئے بہت مشکل تھا۔ مگر یہی وہ وقت ہوتا ہے جب گورکن کو اپنا آپ نہیں، زمین کھودنی ہوتی ہے۔

سارہ ثنا جو میری بھانجیاں ہیں اور اقرا جو میری دوست کی بیٹی ہے (اور اب مجھے ماں کہتی ہے)، ان کے زندگی کے سفر جب ماؤں کے بغیر تصور کرتی ہوں تو کانپ جاتی ہوں۔ ماں کے بغیر کوئی کیسے زندگی گزار سکتا ہے؟ میں تو آج بھی ہر خوشی غمی میں امی کی طرف دیکھتی ہوں، فرق یہ ہے کہ پہلے آنسو بہتے تھے تو زخم ہتھیلی پر رکھ کر ان کو دکھا دیتی تھی۔ اب ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کے لئے اپنی ہتھیلی کو اپنے ہی دوسرے ہاتھ سے ڈھانپ لیتی ہوں کہ مبادا کسی اور کی بھی نظر نہ پڑ جائے۔

میرے ابو نے ہمیشہ میری تحریروں کو غور اور شوق سے پڑھا۔ میری حتی الامکان اصلاح کی، وہ سکول ٹیچر اور اچھے مقرر تھے، مزاح، محبت اور جذباتیت کے ساتھ ساتھ ابو سے یہ صلاحتیں بھی لے لیں۔ ان کا سایہ ہمارے سر پر ہمیشہ رہے۔

فیصل محمود، میرے شوہر کا تعاون حسبِ معمول میرے ساتھ ہے۔ میری ہر تحریر کو شوق سے پڑھتے ہیں اور ان کا یہ شوق مجھے مزید لکھنے پر اکساتا ہے، کیوں نہ ہو ایک بھی سچا قاری مل جائے تو لکھنے والے کو زندگی مل جاتی ہے۔ خدا کرے یہ زندگی میرے ساتھ ایسے ہی رہے۔ میرے بہن بھائیوں کا پیار ہمیشہ میرے ساتھ رہا اللہ ان کو زندگی میں کامیابیاں دے۔ اپنی ایک بہادر اور پیار کرنے والی بہن کو کھو دینے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ یہ بہن بھائی کیسی پیاری نعمتیں ہوتے ہیں۔ آپ ان سے لڑتے ہیں، ان سے روٹھتے ہیں مگر ان کے بغیر آپ کی خوشی بھی ادھوری اور غم بھی۔

ہادی، علینہ، عبداللہ اور احمد میری زندگی کی روشنی ہیں۔ میرے چار ستارے اور میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے میرے سب سے اچھے دوست۔ جب ساری دنیا خوشی اور سکون کو پیسوں کے ترازو میں تول رہی ہے ایسے میں میرے بچوں نے سچی خوشی کا منبع ڈھونڈ لیا ہے۔ جب کوئی مجھ پر تنقید کرتا ہے کہ اس لکھنے لکھانے کے کھیل میں دنیاوی اعتبار سے کتنا

فائدہ ہے، اور میں کبھی کبھار اس سوال سے پریشان ہو کر سوچتی ہوں اپنے پرانے پیشے بنکنگ کو دوبارہ جوائن کر ہی لوں تو ایسے میں میری بیٹی علینہ مجھے چپکے سے کہتی ہے mama do whatever gives you satisfaction, dont think in material term its not "you" so just b youself.

عمران علی کی مشکور ہوں جس نے ہمیشہ بے غرضی سے میرا ساتھ دیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ میرے افسانوں کو کتابی شکل میں لانے میں اس کا ہی ہاتھ ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ میں سدا کی سست، مگر یہ عمران کا خلوص اور لگن تھی کہ اس نے مجھے بار بار کہہ کر اسے مکمل کروایا۔ **ماورا** پبلشرز کے دفتر میں جا جا کر میری کہانیوں کی فارمیٹنگ ہوتی دیکھی اور ایسی ہی خوشی محسوس کی جیسے کوئی اپنی تخلیق کو دیکھ کر کرتا ہے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ نفسا نفسی کے ایسے دور میں، میرے پاس ایسا مخلص دوست ہے۔ عمران خود ایک چھپا ہوا گوہر ہے جس نے جس دن لکھنا شروع کر دیا، اس دن ادبی نہیں تو کم از کم سیاسی اور تاریخی کتابوں کے اُفق پر ایک خوشگوار اضافہ ہوگا۔

پروفیسر شاہد، میرے اور خالد شریف جیسے عالم فاضل، تجربہ کار اور ایماندار پبلشر کے درمیان رابطے کا پل بنے، ان کا بہت شکریہ۔ **ماورا** پبلشرز کے ساتھ کتاب چھپوانے کا میرا یہ پہلا تجربہ انتہائی خوشگوار رہا۔

امید ہے میری یہ کہانیاں ادبی اور عوامی معیار پر پوری اتریں گی اور تب تک جان سولی پر لٹکی رہے گی۔۔۔ دعائیں۔

روبینہ فیصل

مسی ساگا، کینیڈا

محبت کی آخری کہانی

اس لڑکی کے چہرے پر نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ جب وہاں سے گذرتی تو وہ اجنبی سارے منظر کو بھول کر صرف اس کو دیکھنے میں محو ہو جاتا اور اسے ایسا لگنے لگ جاتا جیسے تمام کائنات ان خوبصورت پیروں میں آ کر ٹھہر گئی ہے، وہ چلتی تو سب مناظر چلنے لگتے، وہ رکتی تو اس کے ساتھ سب کچھ تھم سا جاتا، وہ بھاگتی تو کائنات اس کے ہاتھوں سے نکل کر بھاگنے لگتی اور وہ سوچتا وہ جو کچھ دنوں سے تھک ہار کر اس درخت کے بوڑھے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا ہے، کیا وہ اس کائنات کے ساتھ بھاگنے کی سکت رکھتا ہے۔۔۔؟

کیا تم happy prince ہو؟

آج نجانے وہ اس کے پاس سے بھاگتے ہوئے، گزر نہیں گئی تھی، بلکہ رک کر اسے بڑی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

کیا تم ہیپی پرنس ہو۔۔؟ لڑکی نے اسے خاموش پا کر اپنا سوال دہرایا تو اسکی گونج جھیل کے پانی سے ٹکرا کر سامنے دوڑتی سڑک، اس کے کنارے ایستادہ درختوں، ان پر بیٹھے پرندوں، چہل قدمی کرتے بوڑھوں، سٹرالر میں بچوں کو ڈالے تیز تیز قدم اٹھاتی ماؤں، اپنے کتوں کے ساتھ بھاگتی گوری میموں کے کانوں تک پہنچ گئی اور وہ چونک گیا، اسے یوں لگا یہ پوری جھیل اور اس سے جڑے تمام مناظر بھی لڑکی کے اس سوال کو سن کر چونک سے گئے ہیں اور اب سب اس کی موجودگی کو محسوس کر رہے ہیں اور وہ جو اتنی دیر سے

سب سے اوجھل ہو کے بیٹھا تھا، اس سوال کی تیز روشنی میں سب کی نظروں میں آ گیا ہے۔۔اس نے چندھیائی آنکھوں سے جواب دیا:

نہیں، میں تو ہیپی پرنس نہیں ہوں۔مگر لگتا ہے تم کائنات ہو؟

نہیں میں تو کائنات نہیں۔۔۔میں تو۔۔۔۔

تم تو کیا۔۔؟ وہ شرارت سے مسکرایا۔

میں تو بس ایک پرندہ بننا چاہتی ہوں۔۔کائنات نہیں۔وہ بھی شہ پاتے ہی شوخی سے بولی۔

"ایسا کیوں؟ پرندہ کیوں بننا چاہتی ہو؟

"اڑنا چاہتی ہوں، اس زمین کو اوپر سے اڑتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں، ہیپی پرنس کی مدد کرنے والا پرندہ مر گیا تھا لیکن میں مرنا نہیں چاہتی۔" شرارت کی جگہ ایک ان دیکھے خوف نے لے لی۔۔

وہ ہنسنے لگا۔۔"تم کتنی معصوم اور شفاف ہو، کیا تم نے کبھی اپنی آنکھوں کو اس جھیل کے پانی میں دیکھا ہے۔۔؟"

"نہیں، میں خود کو نہیں دیکھتی۔۔وہ ایک ادا سے بولی۔

"تم نے خود کو نہیں دیکھا اور زمین پر بیٹھے لوگوں کو بھی نہیں دیکھتی، تو کیا دیکھتی رہتی ہو؟ اور جب تم یہاں کچھ نہیں دیکھتی تو پرندے کی طرح اڑ کر کیا دیکھو گی؟ وہ اسے ستانے لگا۔
۔۔

"مجھے نہیں پتہ، بس مجھے یہ پتہ ہے وہ جو سامنے جھاڑی میں اُگے پھول ہیں میں ان کو حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ ان کے ساتھ اُگے ہوئے کانٹے میرے ہاتھوں کو لہولہان کر دیتے ہیں۔۔کیا دنیا میں کوئی ایسے پھول ہیں جن کو میں چھوؤں تو میرے ہاتھ زخمی نہ ہوں؟

وہ اداس ہوگئی اوراس کی آنکھوں میں تیرتے پانی کا عکس سامنے خاموشی سے بہنے والی جھیل کے عکس میں جا کر مدغم ہونے لگا اوراس کے اوپر بہتی بطخوں نے رک کراس لڑکی کو دیکھا اور پتہ نہیں انہیں اسکی آنکھوں میں کیا نظر آیا کہ کائیں کائیں کرتی ایک دوسرے کے پیچھے لگ کر بھاگ گئیں۔۔۔

جب سے وہ اس درخت کے سائے میں سستانے کے لئے آکر بیٹھا تھا آج پہلی دفعہ اس نے بطخوں کوایسے چیختے سنا تھا ۔۔

"اچھا ہے تم نے ابھی تک خود کو جھیل کے پانی میں نہیں دیکھا ورنہ خود سے محبت کرنے کے علاوہ تم کسی کام کی نہ رہ جاتی". مسافر نے اس کی اداسی سے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

وہ اس تعریف پر کھلکھلا کر ہنس پڑی، " کہانیاں مجھے بھی اچھی لگتی ہیں یونانی ہوں یا فرانسسی ، روسی ہوں یا اطالوی ، اردو ہوں یا انگریزی۔۔مگر میں جھیل میں اپنا عکس دیکھ کر منجمد نہیں ہونا چاہتی ، میں اڑنا چاہتی ہوں ، بادلوں سے تصویریں لانا چاہتی ہوں ۔۔اور اور۔۔" اس کی آنکھیں جگنوؤں سے بھرنے لگیں۔۔

"اور کیا۔۔؟ مسافر نے مسکرا کر پوچھا۔

لڑکی کی آنکھوں میں خاموش پانی اترنے لگا،" تم میرا مذاق اُڑا رہے ہو؟ اوراس کی قمیض پر بنے پیلے پھولوں کی آنکھیں بھی پانی سے بھر گئیں۔

"نہیں نہیں ۔۔اس نے گھبرا کر لڑکی کی گالوں سے پھسلتے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلی پر روک لیا،" دیکھو یہ موتی ہیں۔۔"

"سورج کی روشنی میں چمک رہے ہیں بس۔۔موتی ووتی کوئی نہیں ہیں۔۔۔" وہ ایسے ہی روٹھی روٹھی سی بولی۔

"میں تمھارا مذاق نہیں اڑا رہا، میں تو سچ مچ جاننا چاہتا ہوں، پھول، بادل۔۔۔اور کیا چاہیئے؟ اس کا چہرہ تجسّس سے بھر گیا۔

اس کے پوچھنے پر لڑکی کی آنکھوں میں پھر سے جگنو چمک اٹھے۔۔وہ سب بھول بھال گئی اور جوش سے ہانپتے ہوئے کہنے لگی:

" تتلیاں۔۔۔سب رنگوں کی تتلیاں۔۔یہ دیکھو میرا مرتبان خالی ہے، اس میں کوئی تتلی نہیں ہے۔میں کوئی بھی تتلی پکڑ نہیں پاتی۔۔میں انہیں چھوتی ہوں اور وہ اڑ جاتی ہیں۔تم میرے ساتھ تتلیاں پکڑو گے؟

"ہاں کیوں نہیں اور میں تمھیں ایسے پھول لا کر دوں گا جن کے ساتھ کوئی کانٹے نہیں ہونگے ، اور انہیں تمھارے بالوں میں لگاؤں گا ، اور پھر تم نے جتنی تصویریں بادلوں میں بنائی ہیں لمبی سی سیڑھی لگاؤں گا اس پر چڑھ کر سب تصویریں اتار لاؤں گا اور تمھارے قدموں میں رکھ دوں گا اور پھر تمھارے کمرے کی دیواروں پر بہت سے رنگ دار ستارے لگا دوں گا اور اس خالی مرتبان کو بھی بہت سی تتلیوں سے بھر دوں گا۔

وہ سب تصویریں، بادل ، رنگ ، پھول ، ستارے اور تتلیاں جو میرے خوابوں میں آتے ہیں۔۔؟ اس کا منہ حیرت اور بے یقینی سے کھلنے لگا۔

"ہاں خواب میں آتے ہیں یا تم جن کے خواب دیکھتی ہو۔۔سب۔۔سب لا دوں گا۔۔کیا میں تمھارا ہاتھ تھام سکتا ہوں؟ مسافر نے دھیرے سے پوچھا۔

اور وہ ، وہ جو دور جھیل کے دوسرے کنارے رنگین پتھر پڑے ہیں ، وہ بھی ؟ وہ سب پتھر بھی۔۔۔؟ لڑکی نے چپکے سے اپنا ہاتھ مسافر کے ہاتھ میں تھما دیا ، ایسا کرتے ہی اس کے زرد گالوں میں لالی دوڑنے لگی اور سیاہ بالوں میں ستارے آ کوندے۔۔

"ہاں وہ بھی۔۔سب لا دوں گا۔۔اس نے لڑکی کے نرم ہاتھوں کو دباتے ہوئے

وعدہ کیا۔۔

"اور بدلے میں مجھے کیا کرنا ہوگا۔۔" لڑکی کو ایکدم سے جیسے یاد آ گیا ہو کہ کوئی بھی چیز مفت میں نہیں ملتی۔۔

"تمھاری آنکھوں کے جگنو، تمھاری ہنسی کی بہت سی پھواریں جو میرے جسم کو ہمیشہ تر رکھیں۔۔ تمھارا یہ نرم گرم ہاتھ ایسے ہی میرے ہاتھوں میں رہے۔۔ بس تمھیں ان سب چیزوں کو ایسے ہی زندہ رکھنا ہوگا، مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے۔۔"

"ہیں؟ بس۔۔۔۔؟۔" لڑکی کو جیسے یقین ہی نہ آیا۔۔

"میں تمھارا دوست ہوں نا؟ اس نے آس بھری نظروں سے لڑکی کو دیکھتے ہوئے پوچھا

"ہاں۔۔ تم میرے سب کچھ ہو۔۔ حیرت ہے میں روز یہاں سے گذرتی تھی، تم مجھے نظر نہیں آتے تھے۔۔ آج ایکدم سے کیسے نظر آ گئے، اور ایکدم سے میرے سب کچھ کیسے ہو گئے؟"

"یہ ایکدم سے نہیں ہوتا، یہ سازشیں بہت سالوں سے اندر ہی اندر تیار ہو رہی ہوتی ہیں۔۔ اب دیکھو، میں تو اس شہر کا بھی نہیں ہوں بس یہاں کچھ دنوں کے لیے رُکا ہوں میں مسافر ہوں، نگر نگر گھومتا ہوں مگر میرا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے مگر اب مجھے یہیں رہنا پڑے گا۔۔"

" کیوں؟ لڑکی نے حیرت سے پلکیں جھپکیں۔۔۔

تم نے اتنے سارے کام جو بتا دئے ہیں، ان کو پورا کرنے کے لئے ایک پوری عمر چاہیئے اس لئے اب میں عمر بھر یہیں رہوں گا۔۔۔

سچ؟ لڑکی خوشی سے چلائی اور اس کے سینے سے چمٹ گئی۔

"میں بہت اکیلی تھی، مجھ سے نہ بادل پکڑے جاتے تھے، نہ تتلی اور نہ پھول۔۔ مگر اب تم آ گئے ہو نا۔۔۔"

وہ پھر رونے لگی مگر اس دفعہ مسافر نے اسے رونے دیا کیونکہ اب لڑکی کی آنکھوں کے موتی مٹی میں نہیں مسافر کے سینے کے بالوں (جو سورج کی روشنی میں سونے کی طرح چمک رہے تھے)، میں جذب ہو رہے تھے اور انکی کی حرارت سے مسافر کے اندر زندگی کی لہریں اٹھنے لگیں۔

"میں تمھیں ہیپی پرنس کہہ لوں؟۔۔۔ لڑکی نے جھیل میں تیرتی بطخوں کے شور میں پھر سے اونچی آواز میں اپنا سوال دہرایا ۔۔

" مگر میں تو ہیپی پرنس نہیں ہوں۔۔" اس نے لڑکی کے ہاتھوں میں گھاس پر اگنے والے پیلے پھول دیکھتے ہوئے سوچا اسے جب جھاڑی کے پیچھے اُگے خوبصورت رنگ برنگے پھول نہیں مل سکے ہونگے تو اس نے ان گھاس کے پیلے پھولوں سے دامن بھر لیا ہوگا۔ ایسی قناعت پسندی دنیا کے تمام دکھ کھا جانے کی طاقت رکھتی ہے۔۔

وہ معصومیت سے بولی: "تم مجسمے کی طرح ساکت بیٹھے ہو، ہلتے جلتے نہیں، نہ جانے تمھیں دیکھ کر مجھے یہ احساس کیوں ہو رہا ہے کہ تم نے اپنے جسم، کپڑوں اور تلوار سے تمام ہیرے نکال نکال کر شہر کے غریبوں کی مدد کر دی ہے اور اب تم خالی ہاتھ ہو اور تمھاری ساری طاقت ختم ہو چکی ہے اور بس تم میرا دل رکھنے کو میرے ساتھ وعدہ کر رہے ہو۔۔"

"نہیں میں ہیپی پرنس کیسے ہو سکتا ہوں؟ جب کہ مجھے اپنا ننھا پرندہ تو ابھی ابھی ملا ہے۔۔" مسافر نے لڑکی کی ناک کو انگلی سے چھیڑتے ہوئے کہا۔ وہ ایک دم سے اس کے سینے سے الگ ہو گئی اور خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولی:

"ہاں میں وہی پرندہ ہوں جس نے ہیپی پرنس کے مجسمے سے اسی کے کہنے پر سارے

ہیرے نکال نکال کر غریبوں کی مدد کی تھی، مگر نہیں میں تو تم سے اپنی زندگی کے لئے مدد مانگ رہی ہوں ہپی پرنس!! کیا تم نے شہر کے سب غریبوں کی مدد کر دی؟"

"ہاں !!اسی لئے یہاں سکون سے بیٹھا ہوں، اب نہ توانائی باقی بچی ہے اور نہ ہیرے۔"۔لڑکی کی آنکھوں میں پھیلی مایوسی دیکھ کر وہ جلدی سے بولا: مگر تم اداس نہ ہو میری جان تم نے تو مجھے نئی زندگی دی ہے، تمھارے سارے خواب پورے کرنے کی مجھ میں طاقت آگئی ہے۔۔اور یہ تمھاری نہیں میری اپنی مدد ہے، میں پھر سے جی اٹھا ہوں۔"

"نہیں! میں اس لئے اداس نہیں ہوں کہ تم میرے خواب پورے نہیں کر پاؤ گے، میں تو یہ سوچ رہی ہوں کیا تم یہاں اس لئے بیٹھے ہو کہ سب لوگوں کی مدد ہو گئی اور اب کسی کو تمھاری ضرورت نہیں یا تم کسی کی مدد کرنے کے قابل نہیں رہے اور پھر کسی کو تمھاری ضرورت نہیں رہی۔۔۔"

آدمی نے چونک کر اس لاپرواہ نظر آنے والی لڑکی کو دیکھ کر سوچا یہ تو ایک لمحے میں زندگی کے کنوئیں میں چھلانگ لگا سکتی ہے۔

"بات تو ایک ہی ہے نا۔۔اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔۔۔

مگر لڑکی نہ جانے کیوں پھر سے رونے لگی۔۔

اب کے مسافر کا دل کانپ اٹھا اور اس نے بڑھ کر پھر سے اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا، اور اس کے آنسوؤں سے بھرے گالوں کو چومتے ہوئے کہا" تمھارے آنسو نمکین نہیں بڑے میٹھے ہیں، انہیں ضائع کیوں کرتی ہو؟ آؤ ہم تتلیاں پکڑیں۔۔۔اور وعدہ کرو اب کبھی نہیں روؤ گی۔۔" اس کے ساتھ ہی وہ چھلانگ مار کر کھڑا ہو گیا اور کسی مسخرے کی طرح لڑکی کے سامنے ایک ٹانگ پر اچھلنے لگا،لڑکی آنسوؤں کے درمیان کھلکھلا کر ہنس پڑی۔۔

"اور جب ہم بہت سی تتلیاں، بادل اور پھول اور رنگین پتھر اکٹھے کر لیں گے تو شہر کے لوگوں کو بانٹیں گے، میں تمھارے ہپی پرنس کی طرح یہیں مجسمہ بن کر بیٹھ جاؤں گا اور تم میرا ننھا پرندہ بن جانا۔۔"

اب لڑکی خوشی کے مارے ناچنے اور تالیاں بجانے لگی پھر اس نے بڑھ کر ہپی پرنس کے گالوں کو بوسہ دیا اور کہا،

" مگر مجھے ننھے پرندے کی طرح کبھی مرنے نہ دینا۔۔۔میں جینا چاہتی ہوں۔۔"

"میری جان تم نے مجھے ایک مقصد دے کر نیا جیون دیا ہے، اور جیون دینے والے کو کون مرنے دیتا ہے؟ تم ہمیشہ زندہ رہو گی ,دیکھو دیکھو! یہ جو تمھارا سایہ درخت پر پڑ رہا ہے اور وہ دیکھو تمھارا عکس جھیل میں جذب ہو رہا ہے اور یہ جو تمھارے سانس کی خوشبو یہاں کی ہواؤں میں شامل ہو رہی ہے اور ان پھولوں کو دیکھو وہ جھاڑیوں سے نکل نکل کر تمھیں مسکرا کر دیکھ رہے ہیں اور تمھاری مسکراہٹ انہوں نے بھی مستعار لے لی ہے، اس پھول پر بیٹھی تتلی کو دیکھو، وہ پھول کا نہیں تمھارے ہونٹوں کا رس چوس رہی ہے، میرے دل نے اور میری محبت نے تمھیں یہاں کے ایک ایک منظر کا حصہ بنا دیا ہے، ان مناظر کو کبھی موت نہیں آئے گی"، وہ لپک لپک کر اسے ایک ایک منظر کی طرف گھسیٹنے لگا۔۔

لڑکی اس کے ساتھ جھومنے لگی اور زور سے چلانے لگی۔۔

" آؤ! جئیں۔۔۔آؤ! مجھے بادلوں کی تصویریں لا دو۔۔ مجھے سارے پھول لا دو ۔۔ میں انہیں اپنی قمیض میں کاڑھ لوں گی اور جب تم ساری دنیا کے رنگ مجھے لا دو گے تو میں انہیں اپنی آنکھوں میں بھر لوں گی۔۔ یہ دیکھو میرا خالی مرتبان۔۔اور یہ دیکھو میرے پاؤں کے زخمی تلوے، خوابوں کی ان تتلیوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے میں نے اپنے پاؤں تو زخمی کر لئے ,اپنے ہاتھ لہولہان کر لئے، مگر کوئی تتلی میرے ہاتھ نہیں آئی۔۔۔اسی لئے یہ شیشے

کا مرتبان اب تک خالی ہے۔۔۔ میرا کمرہ بہت بے رنگا ہے۔۔تم جو رنگ لاؤ گے میں اس سے اپنا کمرہ رنگین کر لوں گی، تم جو سیپیاں اور پتھر اکٹھے کر کے دو گے انہیں کمرے کی الماریوں میں بند کر دوں گی۔۔۔"

"ہاں روز یہاں آیا کرو میرے پاس اور ہم روز ایک خواب کی تتلی، ایک رنگ، ایک پھول، ایک بادل، ایک تصویر اور رنگین پتھر جمع کریں گے۔" مسافر نے اس کے بھرے بھرے سرخ ہونٹوں پر ہونٹ رکھتے ہوئے اس سے وعدہ لیا اور وعدہ کیا۔

"اے ہپی پرنس کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟؟؟؟؟؟" وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔تم میرا تتلیوں سے خالی مرتبان تو دیکھ رہے ہو نا؟ میں نے اپنے سارے خواب تمھاری آنکھوں میں انڈیل دئے ہیں مگر میرے کمرے میں ایسے بہت سے مرتبان پڑے ہیں جو دھوکوں سے بھرے پڑے ہیں۔اور دیواروں پر ایسی بہت سی تصویریں اگی ہوئی ہیں جن میں جھوٹ اور مکر کی جیت ہو رہی ہے اور سچ اوندھے منہ پڑا ہے۔دروازوں سے لالچ اور ہوس کی رالیں ٹپک رہی ہیں اور جھوٹے وعدوں سے میرے کمرے کی چھت زمین تک جھک گئی ہے۔اس لئے مجھے کسی بات کا اب یقین نہیں آتا۔میں سایوں کو بھوت سمجھنے لگ گئی ہوں اور پھولوں سے پہلے مجھے کانٹے نظر آنے لگ جاتے ہیں۔میرا اعتماد ریزہ ریزہ ہے اور اگر میں تم پر اعتبار نہ کر سکی تو کیا تب بھی تم میرے خوابوں کی تلاش میں میرے ساتھ نکلو گے۔؟۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے، اسکی آنکھوں میں تکتی جا رہی تھی اور خاموش آنسو اس کی گالوں سے بہہ کر اس کی گردن کو چوم رہے تھے۔

مسافر نے ان گرم آنسوؤں پر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ رکھ دئے۔۔اوہ!! میری محبوب مت رو، آج کے بعد تمھاری آنکھوں کی تلاش ختم ہوئی، میں تمھیں محبت، رنگ اور خوشبو کے لئے اب اور نہیں رونے دوں گا۔تم نے بہت رو لیا اب اپنے سارے آنسو مجھے

دے دو اور آؤ مل کر تتلیوں کے پیچھے بھاگیں، بادلوں کی تصویریں کتابوں میں بھر لیں۔۔ ایک کمرہ بنائیں جس میں اتنے رنگ ہوں کہ بے رنگی کوسوں دور بھاگ جائے، میں اور تم مل کر دھوکوں کے اوپر محبت اور اعتماد کا پل بنائیں گے، چھوڑ کے جانے والوں کی قبر پر زندگی کا تا حیات جلنے والا چراغ جلائیں گے۔۔"

دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما اور اکٹھے بھاگنے لگے لڑکی کے گالوں کی زردی مدہم پڑنے لگی اور اس کی کھنڈر آنکھیں خوابوں سے بھر کر چمکنے لگیں، اس کے کمرے سے سارے دھوکے اور بدگمانی کے رنگ دھندلانے لگے، اور بادلوں میں گندھی خوبصورت تصویریں اس کے کمرے کی دیواروں پر ابھرنے لگیں، دروازوں سے ہوس کے کانٹوں کی بجائے پھولوں کی خوشبو دستک دینے لگی اور مرتبان میں روز پیار اور اعتبار کی ایک نئی تتلی بھرنے لگی۔۔لڑکی یہ سب پا کر اتنی ہلکی اور مسرور ہو گئی کہ ہواؤں میں اڑنے لگی۔۔

مسافر اس کی آنکھوں کے جگنوؤں کو دیکھ دیکھ کر کہتا "میرا ننھا پرندہ" اور اسے لگتا اب اس کے جسم میں بھری صدیوں کی تھکاوٹ دور بھاگ گئی ہے۔

لڑکی کی آنکھیں، کمرے کی دیواریں، دروازے اور مرتبان سب رنگوں سے بھرنے لگے تو لڑکی جو ساری عمر بے اعتباری کی ڈسی ہوئی تھی مسافر کے ساتھ چلتے چلتے اسے کہتی: "قسم کھاؤ مجھ سے میرا وجود نہیں چھینو گے، یہ خوشی کے رنگ، یہ خوشبو بھری سانسیں، یہ بادلوں سے اتری تصویریں، یہ رنگا رنگ پتھر یہ سب میرے پاس رہنے دو گے۔۔؟ دیکھو میرا مرتبان تتلیوں سے بھر گیا ہے۔۔یہ ایسے ہی بھرا رہے گا نا؟۔۔۔۔۔کوئی چور یہ سب چرا کر تو نہیں لے جائے گا۔۔؟"

" کوئی چوری نہیں کرے گا، مگر تم خود لوگوں میں یہ حسین خواب، یہ خوشبودار پھول، یہ پیارے پیارے رنگ، یہ بادلوں کی تصویریں اور رنگین پتھر، بانٹو گی۔بانٹو گی نا؟۔

کیونکہ تم میرا ننھا پرندہ ہو، جس نے پیپی پرنس کے مجسمے میں حرارت بھری ہے اور اسے پھر سے دنیا کی مدد کرنے کے قابل بنا دیا ہے، جب کہ وہ بالکل سرد اور کنگال ہو چکا تھا۔۔"

"ہاں میں بھی قافلے سے بچھڑا ایک پرندہ ہی تو تھی، بالکل تنہا تھی، وعدہ کرو، یہ زندگی مجھ سے واپس نہ لینا۔۔۔میں تمھارے ساتھ مل کر سب اکٹھا کر سکتی ہوں تو بانٹ بھی سکتی ہوں بس تم میرے ساتھ ہی رہنا، مجھے تنہا نہ چھوڑنا۔۔پھر میں سب کر گذروں گی۔"

دن یونہی خوابوں کی تتلیاں اکٹھی کرتے اور انہیں بانٹتے ہوئے گذرنے لگے۔۔۔

اور پھر ایک صبح۔۔۔۔ایک منحوس صبح۔۔۔

لڑکی گہری نیند سے بیدار ہوئی تو نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔۔وہ خوف زدہ ہو کے آنکھیں ملتی جھیل کی طرف بھاگی، اسی مخصوص درخت کے پاس پہنچی تو وہاں کوئی ٹیک لگائے نہیں بیٹھا تھا۔اس نے گھبرا کر ساتھ پڑے بنچ کو دیکھا، وہ بھی خالی تھا۔۔۔

"کہاں ہو؟ وہ زور سے چلائی، چہل قدمی کرتے لوگوں نے رک کر اسے دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں ٹھہرا سوال اور خوف دیکھنے والوں کے دلوں میں خواہ مخواہ ہمدردی پیدا کر رہا تھا ویسے بھی وہ روز وہاں سے گذرتے ہوئے اس سیاہ بالوں والی لڑکی اور اُس مسافر کو تتلیوں، رنگوں اور بادلوں کے پیچھے بھاگتے، قہقہے لگاتے، باتوں کی پھلجڑیاں اڑاتے دیکھتے تھے اور انہیں اس منظر کا حصہ سمجھنے لگ گئے تھے اور آج ان کے لئے بھی منظر ادھورا ہو چکا تھا۔۔۔

جھیل کے پانی میں برف جم چکی تھی مرغابیاں، بگلے سب ہجرت کر چکے تھے۔اُس درخت کے بھی سارے پتے جھڑ چکے تھے اور وہ ٹنڈ منڈ زار و قطار تنہا کھڑا رو رہا تھا، اور اس کے آنسو برف کے گولے بن کر اس کی شاخوں سے جھول رہے تھے، اس کے ساتھ ٹیک

لگانے والا انجانے کس دیس چلا گیا تھا، اب وہاں کوئی نہیں تھا۔کوئی سایہ بھی نہیں۔۔

لڑکی کو مسافر کی تلاش میں حواس باختہ ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے دیکھ کر ایک گوری بوڑھی عورت نے اس کے پاس رک کر اسے اپنے تجربے کے زور پر سمجھاتے ہوئے کہا:

"وہ مسافر تھا نا؟"

"نہیں وہ پیپی پرنس تھا۔۔" لڑکی نے جیسے اس بوڑھی کی بات سنی ہی نہ ہو

"ہجرتوں کے اس موسم میں سب مسافر ہی چلے جایا کرتے ہیں۔" بوڑھی نے بھی جیسے لڑکی کی بات سنی ہی نہ ہو۔

"نہیں وہ کبھی مسافر ہوا کرتا تھا، مگر اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ سفر کا پہیہ روک دے گا اور یہیں، میرے پاس رہے گا." وہ بوڑھی عورت کو تفصیل سے سمجھانے لگی۔۔

"مسافر کبھی ایک جگہ نہیں ٹھہرتے ہیں، بوڑھی عورت نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ان کے بغیر جینے کی عادت ڈالنی پڑتی ہے۔

"نہیں! وہ سفر سے بہت تھک گیا تھا۔وہ صرف میرے لئے زندہ ہوا تھا۔اس میں چلنے کی سکت بھی نہیں تھی, وہ کیسے جا سکتا ہے۔۔اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مسافر نہیں رہے گا۔۔"

اس کے بغیر جینا سیکھ لو۔۔انگریز بوڑھی نے اپنے کتے کو پچکارتے ہوئے لڑکی کو سمجھایا۔۔لڑکی نے سہم کر بوڑھی کی آنکھوں میں دیکھا، وہاں کسی کے لمبے انتظار کی قبر بڑی واضح کھدی ہوئی تھی، جس پر اسے اپنا کتبہ لکھا نظر آیا اور وہ خزاں کے پتے کی طرح کانپنے لگی۔۔۔

اب وہ اُسی درخت کے نیچے بیٹھی پیپی پرنس کا انتظار کرنے لگی۔تتلیاں اس کا منہ چوم چوم کر اسے چھیڑتی رہیں، ہواؤں نے اس تک پھولوں کی خوشبو پہنچائی، بادلوں نے

اپنی تصویروں میں طرح طرح کے رنگ بھرے، اور دور پڑے پتھروں نے اپنے رنگوں کی چمک سے اس کی آنکھیں خیرہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ پتھر سی بنی اسی درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی رہتی۔۔ پھر شام ڈھلتے ہی چپکے سے اٹھ کر اپنے گھر کو چل دیتی، وہاں وحشت اور بھی زیادہ ہوتی، کمرے کی دیواروں سے سب رنگوں اور بادلوں کی تصویریں غائب ہونے لگیں۔

اب کمرہ پہلے جیسا بے رنگا ہو گیا تھا۔ تتلیوں کے مرتبان سے کسی چور نے تمام تتلیوں کے پر نوچ کر انہیں مردہ حالت میں فرش پر چھوڑ دیا تھا، وہیں پر ٹوٹے خوابوں کے کانچ بھی بکھرے پڑے تھے، یہ سب دیکھ کر جب وہ دیوانہ وار اِدھر اُدھر بھاگتی تو اس کے پیروں کے تلوؤں میں کانچ چبھ جاتے مگر اسے نہ تکلیف کا احساس ہوتا نہ بہتے خون کا، کھڑکی پر رکھے پتھروں سے رنگ اڑ چکا تھا اور ان کی بے رنگی ماحول کو اور بھی ماتم زدہ کر رہی تھی۔ یہ سب دیکھ کر اس کا سینہ غم سے پھٹنے لگتا اور وہ کمرے سے گھبرا کر جھیل کی طرف بھاگ اٹھتی، اس کے پاؤں سے خون رس رس کر راستے کو رنگین کرتا تھا اور اس کا دل خوف سے سیاہ پڑتا جاتا تھا۔ سیر کے لئے آنے والوں کو اسکی آنکھوں میں جگنوؤں کی قبریں دور سے نظر آنے لگیں۔

وہ تتلیوں، بادلوں، رنگوں، پتھروں اور پھولوں کی اتنی عادی ہو گئی تھی کہ اب ان کے بغیر جینے کا مطلب موت تھی۔ جھیل کنارے پہنچتی تو وہاں پپی پرنس کی جگہ خالی ہوتی تھی اور ہر طرف لوگوں کے ہجوم کے باوجود سناٹا اسے کاٹتا تھا۔ وہ واپس کمرے کی طرف بھاگتی تو وہاں کی تنہائی اور بے رنگی اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی۔۔ جھیل اور کمرے کے درمیان بھاگتے بھاگتے وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کے رہ گئی تھی۔

اور پھر ایک دن وہاں کتوں کو اور سٹرولر میں ڈال کر بچوں کو سیر کروانے والوں نے

دیکھا ایک لڑکی اسی درخت کے نیچے اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے ملائے ایسے بیٹھی ہے جیسے اسکے اپنے ہی ہاتھ ایک دوسرے کو سہارا دے رہے ہوں اور جب لوگوں نے قریب جا کر اس کے جسم کو دیکھا تو وہ منجمد تھا اور اس لڑکی کا سر اس کے سینے پر جھکا ہوا تھا اور گالوں پر آنسوؤں نے برف کی صورت اختیار کر لی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے لڑکی ساری رات اپنے ہی سینے پر سر رکھ کر روتی رہی ہے اور اس کی کھلی آنکھوں میں جب جھانکا تو شکایت کی یہ تحریر سب کو نظر آئی "کہاں گیا وہ سینہ جس نے میرے آنسو جذب کرنے تھے؟" شکایت کے ساتھ لڑکی کی بے جان کھلی ہوئی آنکھوں میں انتظار کی قبر جس کے کتبے پر پپی پرنس اور ایک ننھے پرندے کی تصویر بڑی واضح نظر آ رہی تھی۔

لاش جلد ہی ہٹا لی گئی مگر بہت دیر تک وہاں چہل قدمی کے لئے آنے والوں کو اس درخت پر لڑکی کا چہرہ، جھیل کے پانی میں اس کا عکس، اور ٹھہرے بادلوں میں اس کی تصویر نظر آتی رہی اور جب لوگ اس درخت کی خوشبو کو سونگھتے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھتے یہ کیسی نایاب خوشبو ہے!! تو وہ تنہا کھڑا درخت ہی جانتا تھا کہ وہ اس کی خوشبو نہیں بلکہ ان دو جسموں کی تھی جو یہاں بیٹھ کر ایک دوسرے کی عبادت کرتے تھے۔

اب بھی درخت کے کانوں میں لڑکی کی روتی ہوئی التجا گونجتی رہتی ہے "میں چھوٹے پرندے کی طرح مجسمے کے قدموں میں مرنا نہیں چاہتی، میں جینا چاہتی ہوں"۔۔

اور پپی پرنس کی آواز آج بھی وعدہ کرتی سنائی دیتی ہے۔۔"میں تمھیں مرنے نہیں دوں گا۔۔ تم ہمیشہ زندہ رہو گی۔۔۔۔"

اور ان کی محبت کا چشم دید گواہ، یہ ٹنڈ منڈ درخت جس پر خزاں کا موسم ٹھہر گیا ہے اور اب موسم بہار میں بھی اس پر پتے نہیں نکلتے، ہر وقت روتا اور خود سے پوچھتا رہتا ہے کہ لڑکی کا وہم سچ تھا یا مسافر کا وعدہ؟

حلال بیوی

"یہ تمھارا گھر آنے کا وقت ہے؟ شوہر کو دیکھتے ہی بیوی چنگھاڑی۔۔

"میرے سر میں شدید درد ہے، مجھے چائے کا ایک کپ دے دو۔" شوہر کے چہرے پر تھکاوٹ صاف نظر آ رہی تھی۔

"یہ ڈرامے بند کرو، باہر عیش کر کے آتے ہو اور گھر کے اندر گھستے ہی منہ پر جان بوجھ کر بارہ بجا لیتے ہو، میرے ماتھے پر لال مارکر سے" پاگل" لکھا ہوا ہے۔۔؟" بیوی نے اپنے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔۔

" پاگلوں کے ماتھے پر پاگل لکھا ہوتا تو کیا ہی بات تھی، مگر بائی دا وے آپ پاگل نہیں ہیں بلکہ دوسروں کو پاگل کر دینے والی مشین ہیں۔"

"میں نے تمھیں پاگل کیا ہے؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہاں کینیڈا لا کر تم نے مجھے قید تنہائی میں رکھ رکھ کر پاگل کر دیا ہے، خدا تمھیں پوچھے۔

"خدا تو پوچھ ہی لے گا فی الحال تم چائے کا ایک کپ بنا دو۔۔۔" شوہر نے چائے کے کپ کے لئے اپنی سی کوشش جاری رکھی۔

"تمھارے باپ نے شادی کے وقت یہ نہیں بتایا تھا کہ تمھارے لئے ایک بیوی نہیں ایک خادمہ خرید کے لے جا رہے ہیں۔۔"

"مجھے چائے پلانے سے تم خادمہ بن جاؤ گی؟ اور میں جو سارا سارا دن جاب جانے

کے بعد، نئی جاب کی تلاش کے لئے سڑکوں پر دھکے کھاتا پھرتا ہوں، اور ساتھ کے ساتھ odd job کر رہا ہوں تا کہ تم لوگوں کو گھر بٹھا کر عزت کے ساتھ کھلا سکوں تو میں تمھارے باپ کا نوکر ہوں؟"

"یہ تمھارا فرض ہے۔ اور خبردار میرے باپ تک پہنچے۔۔۔"

"اور تم چاہے میرے باپ اور اس کے آگے سے باپ تک بھی جا پہنچو۔۔ ہے نا؟ تمھاری کوئی حد نہیں ہے؟ اور نہ ہی تمھارا کوئی فرض ہے۔ شوہر کا اب غصے کے مارے برا حال تھا۔

"ہاں میرا کوئی فرض نہیں ہے، یہاں کینیڈا میں عورت کے صرف حقوق ہیں۔۔ تمھیں اب تک پتہ نہیں چلا؟ اور میری کیوں حد ہو گی، میں عورت ہوں جس کے ساتھ ہزار ہارمونز کی تبدیلی کے مسائل جڑے ہوتے ہیں۔ تم ہٹے کٹے مرد۔۔۔"

"مرد ہوں تو کیا انسان نہیں ہوں؟ یا کینیڈا آ کر ڈکشنری میں آدمی انسانوں کے قبیلے سے نکل جاتا ہے، اور بس عورتوں کا punching bag بن جاتا ہے اب اپنا منہ بند کرو اور دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔۔"

"نہیں دفعہ ہوتی کیا بگاڑ لو گے؟ ہاتھ اٹھاؤ گے۔۔ لو مارو۔۔ بیوی چھاتی تان کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔۔

"میں تمھارے منہ نہیں لگنا چاہتا۔ تمھاری تو یہ entertainment ہے۔۔"

"منہ نہیں لگنا تھا تو شادی کیوں کی تھی؟ تب تو روز تمھارے ماں باپ اور چنڈال بہنیں دروازے پر ناک رگڑنے پہنچ جاتے تھے۔۔ کیسا پھنسایا ہم سیدھے سادے لوگوں کو۔۔ کیا تھا تمھارے پاس تب؟ کرائے کا گھر، عام سی نوکری۔۔"

"میری بہنوں کو چنڈال کہہ رہی ہو۔۔ منہ توڑ دوں گا تمھارا۔۔ اور تم کون سی کسی

رئیس خاندان کی مہارانی تھی۔۔"

"توڑ کے تو دکھاؤ۔۔آؤ بڑھو آگے، کیوں ہاتھ کیوں روک لیا؟ میں تو چاہتی ہوں ایک دفعہ اب یہ فیصلہ ہو ہی جائے مگر یہاں کینیڈا میں تم لوگوں کی مردانگی تیل لینے چلی جاتی ہے، مار و اب۔۔۔میرے خاندان تک پہنچے ہونا۔۔تو مارو بھی اب۔۔"

"بڑی کم ذات عورت ہو تم ، مار نہیں سکتا نا تمھیں؟ تمھیں فیصلہ چاہیئے نا؟ جا کرتا ہوں فیصلہ پھر تو آرام سے لیٹنے دو گی؟ پھر تو زبان بند ہو جائے گی؟"

"اتنی تمھاری اوقات تم فیصلے کرو گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"ایسی بات ہے لو دیکھو پھر میری ہمت :

"میں تمھیں طلاق دیتا ہوں ، طلاق دیتا ہوں ،طلاق دیتا ہوں ,اب تو نکل جاؤ کمرے سے اور مجھے سکھ کے دو سانس لینے دو۔۔اب تو جاؤ کمرے سے۔۔ہو گیا فیصلہ۔

بیوی وہیں سر پکڑ کر دھڑام سے زمین پر آ رہی۔۔۔"اللہ یہ کیا کر دیا۔۔؟۔

تھوڑی دیر یونہی ساکت بیٹھی رہی اور پھر گم سم سی کمرے سے گھسٹتی ہوئی باہر نکل گئی۔۔۔

"شکر ہے نا ہنجار چپ ہوئی اور کمرے سے دفعان ہوئی، دو گھڑی سکون سے انسان سو بھی نہیں سکتا۔۔" شوہر یہ سوچتا ہوا کمبل منہ پر لپیٹ کر لیٹ گیا۔۔۔labor job اور نئی جاب ڈھونڈنے کی تھکاوٹ اس پر اس قدر طاری تھی کہ وہ لیٹتے ہی خوابوں کی دنیا میں چلا گیا۔۔۔

ابھی خوابوں کی حسین دنیا، (جس میں وہ پاکستان میں اپنے دفتر میں بیٹھا ٹی بوائے سے فائل منگوا رہا تھا) کے وہ مزے ہی لے رہا تھا کہ اس کے گیارہ سال کے بیٹے نے آ کر اس کا شانہ زور زور سے ہلا کر اسے حقیقت کی سنگلاخ زمین پر پھر سے پٹک دیا۔۔

"پاپا, پاپا اٹھئے ، مجھے اپنے پروجیکٹ کے لئے آئل کلر ابھی چاہیئں۔۔ابھی۔۔۔"

"بیٹا ماما سے کہو۔۔مجھے خدا کے واسطے سونے دو۔۔میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے اور میرا جسم نیند سے ٹوٹ رہا ہے۔"

"ابو ماما سے کیا کہوں وہ باہر بیٹھی روئے جا رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ انہیں اب یہاں سے جانا پڑے گا۔۔پاپا ماما کو کہاں جانا پڑے گا اور کیوں۔۔پاپا، انہیں جہاں بھی جانا ہے مگر رونے کی اس میں کیا بات ہے؟ اور میرے آئل کلر کا ان کے جانے سے کیا تعلق ہے۔؟ پاپا اٹھ جائیں پلیز۔۔آپ سو رہے ہیں ماما رو رہی ہیں۔۔میری کسی کو فکر نہیں۔۔۔"

بیٹے کی روہانسی آواز نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا، وہ اپنے بیٹے کو روتے نہیں دیکھ سکتا تھا،

"اچھا چلو میں اٹھ گیا، جاؤ ماما کو بلا کر لاؤ، سب چلتے ہیں۔"

"سب چلتے ہیں؟ بچے نے بے یقینی سے پوچھا اور بھاگتا ہوا ماں کے پاس پہنچا۔

چھوٹی بیٹی جو کمرے میں ادھر ادھر ہراساں سی گھوم رہی تھی جیسے باہر کوئی جن آ گیا ہو، بولی میں بھی ساتھ چلوں گی پاپا؟

" کیوں نہیں سب چلیں گے۔۔پاپا نے بیٹی کی خوفزدہ آنکھیں پڑھنے کی کوشش کی۔۔

"ابو سب نہیں جا سکتے، اتنے میں بیٹا ماں کو پوچھ آیا تھا۔۔

" کیوں نہیں جا سکتے؟ باپ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"ماما کہہ رہی ہیں اب وہ آپ کی بیوی نہیں رہی ہیں اور آپ ان کے لئے۔۔۔

بھول گیا۔۔کچھ ہو گئے ہیں۔۔۔stranger شائد۔۔"

شوہر نے بے ساختہ کہا۔۔نامحرم؟نہیں بیٹے ماما ایسے ہی غصے میں کہہ رہی ہیں۔۔ ہم میاں بیوی ہیںstrangers کیوں ہونے لگے۔"

اور بھاگم بھاگ بیوی کے پاس پہنچا۔۔وہاں بیگم نے رو رو کے آنکھیں سرخ کر رکھی تھیں اسے دیکھتے ہی ہسٹریائی انداز میں چلائی" نکل جائیں میرے کمرے سے آپ میرے لئے نامحرم ہیں۔"

بیگم کے آگے ٹی وی ڈراموں کے ایسے سارے سین تیزی سے چل رہے تھے، جن میں شوہر غصے میں آکر" طلاق طلاق طلاق" کہتے تھے اور پھر عورت کی ایسی چیخ و پکار شروع ہوتی تھی کہ الامان،الحفیظ۔۔

بیگم نے وہ سب ڈائلاگ بغیر کسی دشواری کے دہرانے شروع کر دئے۔ مجھ سے بات نہ کریں، ہٹ جایئے مجھے چھونے کی کوشش بھی نہ کریں۔۔۔میں آپ کے اوپر حرام ہو گئی ہوں۔۔"

ہیں؟۔۔۔شوہر کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔۔میں غصے میں تھا میرا وہ مطلب نہیں تھا۔۔"

"آپ کا مطلب جو بھی تھا، یہاں کہانی ختم ہو گئی ہے۔۔۔میں آپ کی بیوی نہیں رہی۔"

"نہیں ایسا کیسا ہو سکتا ہے؟ بارہ سالوں کی شادی ایسے ہی کیسے محض تین الفاظ سے ختم ہو سکتی ہے؟"

بیوی کی ہٹ دھرمی دیکھ کر اب شوہر کے ہاتھوں کے سارے طوطے اڑ چکے تھے اور بچے حواس باختہ سے ڈرے سہمے کبھی ماں کا اور کبھی باپ کا منہ دیکھ رہے تھے۔ بچوں کی

ایسی حالت دیکھ کر وہ بیوی کے پیروں میں بیٹھ گیا۔۔" مجھے معاف کر دو۔۔میں نے وہ نہیں کہا تھا۔۔۔"

"ہٹ جائیں پیچھے، میرے پاؤں چھونے کا حق آپ کھو چکے۔۔میں اب آپ کی بیوی نہیں ہوں، یہ گناہ ہے۔۔"

بیوی نے ڈرامے کی اس اداکارہ کی ہو بہو نقل کرتے ہوئے کہا جسے اس کے شوہر نے ایسے ہی غصے میں کھڑے کھڑے تین طلاقیں دے دی تھیں، وہ تو رات کے اندھیرے میں جھٹ پٹ سامان اٹھا کر رکشہ کرا کے ماں کے گھر بھاگ گئی تھی مگر یہاں پردیس میں نہ رکشہ تھا اور نہ ماں کا گھر، اس لئے وہ ڈائیلاگ تو ویسے کے ویسے بول سکتی تھی مگر اس گھر سے جائے گی کہاں۔۔۔اور بچوں کا کیا کرے گی؟ ڈرامے میں بچے نہیں تھے۔۔

"ہم کون سا ٹھیک والے مسلمان ہیں، نہ ہم نماز پڑھتے ہیں اور میں تو روزے بھی نہیں رکھتا، تو پھر یہ کیا؟" ۔شوہر نے ورغلانے کی اپنی سی پوری کوشش کی۔

"آپ مجھے گناہگار نہ کریں، آپ مجھے اللہ کے حکم کے خلاف نہیں لے جا سکتے، ہاں آپ کے ساتھ کسی مسجد کے امام کے پاس جا سکتی ہوں اگر وہ کہہ دیں تو کوئی حرج نہیں۔۔ مگر اس طرح آپ کے ساتھ اب نہیں رہ سکتی۔۔گنہگار نہیں ہو سکتی۔"

"چلو کوئی تو راستہ بتایا بیگم نے"، شوہر اسے لے کر بھاگم بھاگ قریبی مسجد کے مولوی کے پاس پہنچا جہاں وہ کبھی کبھار عید کی نماز پڑھنے جاتا تھا۔مولوی صاحب نے ساری بات انتہائی تحمل سے سنی اور پھر آنکھیں بند کر کے اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور کہا:

"یہ سب سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بدقسمتی سے آپ لوگوں کی طلاق ہو چکی ہے اور اس صورت میں آپ لوگ اکٹھے نہیں رہ سکتے، آپس میں بات نہیں کر سکتے ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتے ورنہ یہ بہت بڑا گناہ ہو جائے گا کیونکہ اب آپ دونوں ایک

دوسرے کے لئے نامحرم ہوگئے ہیں۔۔"

" مگر مولوی صاحب،ہم تو سارادن کتنے نامحرموں سے باتیں کرتے ہیں، ساتھ کھاتے پیتے اٹھتے بیٹھتے ہیں، ہاتھ ملاتے ہیں اور اکٹھے ہی رہتے ہیں۔۔تقریبا۔۔۔"

"یہ شرعی مسئلہ ہے تم یا تو خود بول لو، یا میری بات سن لو۔۔" ۔مولوی صاحب کے چہرے پر ناگواری دیکھ کر بیوی تو ڈر گئی۔۔

نہیں نہیں یہ تو ہیں ہی ایسے، ایسے گھٹیا نہ ہوتے تو یہ گھناؤنی حرکت کرتے ، میں تو مولوی صاحب صرف بچوں کی وجہ سے ان کے ساتھ دوبارہ رہنا چاہتی ہوں کوئی حل بتائیے۔۔"

" حلالہ۔۔بس یہی ایک حل ہے ۔" مولوی صاحب نے توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، آنکھیں پھر سے موندلیں۔۔

" حلالہ؟ شوہر چونکا۔۔یعنی اپنی ہی بیوی کو حلال بنانے کا طریقہ؟"

" تم پھر بولے۔۔ بولو منظور ہے کہ نہیں ۔۔؟ میرے قیلولے کا وقت ضائع ہو رہا ہے، غلطیاں تم لوگ کرو اور سزا ہم بھگتیں؟۔"

دونوں میاں بیوی آخری سہارا ہاتھ سے جاتے دیکھ کر بدحواسی میں اکٹھے ہی بولے "ہمیں منظور ہے مگر کرنا کیا ہوگا؟ "

"یہ ہوئی نا بات۔۔شکر ہے تم لوگوں میں اسلام زندہ ہے میاں! کرنا یہ ہوگا کہ اپنی بیوی کی شادی کسی اور مرد سے کروادو اور پھر تمھاری بیوی کا جب اس کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم ہو جائے تو اس سے طلاق دلوا لینا اس طرح تمھاری بیوی تم پر حلال ہو جائے گی او پھر سے تم سے نکاح کی اہل ہو جائے گی، بس اتنی سی بات، نادانو اسلام آسانی کا مذہب ہے۔"

" مگر مولوی صاحب غصہ انہیں آیا، غلطی ان کی اور کسی غیر آدمی سے شادی کر کے

اپنا جسم میں اسے پیش کروں؟ بیوی کو اب پتہ چلا ڈرامہ کیا ہوتا ہے اور حقیقت میں اپنے اوپر برتنا کیسا ہوتا، اس حل کے بعد تو اسے اپنی ساری ڈرامے بازی نکلتی محسوس ہوئی۔۔

"بی بی یہی ایک حل ہے، مولوی صاحب کی آنکھوں میں نجانے نیند کا خمار تھا یا کیا تھا، بی بی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے

" حلالہ نہیں ہوگا تو ایسے ہی شوہر اور بچوں سے دور رہو گی، گھر ٹوٹ گیا ہے تم لوگوں کا، جوڑنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے، اگر میری بات سننی نہیں تھی تو یہاں لینے کیا آئے تھے؟

" اسے چھوڑیں مولوی صاحب، میں اسے سمجھا لوں گا۔اس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں، بچوں کی خاطر ہم دونوں کو یہ کڑوا گھونٹ بھرنا پڑے گا۔مگر مولوی صاحب میں ایسا آدمی کہاں سے ڈھونڈوں اور اگر ایسا مل بھی جائے تو کیا گارنٹی کہ وہ رات گذارتے ہی میری بیوی کو چھوڑ دے گا اور ہمارے کہنے پر طلاق بھی دے دے گا۔"

"ہاں یہ رسک تو ہوتا ہے اور اگر رسک فری کام کرنا ہے تو تمھیں میاں اس کے لئے بہت اعتباری اور شریف پرہیزگار بندہ چاہئے۔"

" مگر یہی تو کہہ رہا کہ ایسا بندہ کہاں سے ڈھونڈوں مولوی صاحب اگر آپ کی نظر میں کوئی ہو تو۔۔۔؟" ہم آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔۔ہمارا گھر بچالیں مولوی صاحب۔۔۔"

اس کے گڑگڑانے سے مولوی صاحب کا دل پسیج گیا اسی لئے تو بولے:

" آج کے دور میں انسان صرف اپنے پر اعتبار کرسکتا ہے لہذا میرے لئے صرف میں ہی قابلِ اعتبار ہوں، باقی میاں کسی کی گارنٹی نہیں۔۔100% رسک فری کام کے لئے مجھ سے زیادہ موزوں کوئی اور نہیں ہوسکتا۔تم لوگوں کی پریشانی دیکھی نہیں جا رہی".

" آپ مولوی صاحب۔۔۔؟؟ دونوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔۔

"ہاں میں ناچیز ہی یہ کڑوا گھونٹ بھر لیتا ہوں ،مگر میں اس کام کا معاوضہ لیتا ہوں ، زیادہ نہیں 5000 ڈالر،مگر سب کام صاف ستھرا ہوتا ہے۔"

بیوی نے شوہر کو شکایت بھری نظروں سے دیکھا ۔۔اور شوہر نے ان نظروں کا مطلب اپنی طرف سے سمجھتے ہوئے تسلی دی:

"پیسوں کا انتظام ہو جائے گا تم فکر نہ کرو بیگم۔۔"

"بس یہی انتظام ہے کرنے والا ، جو تم کر لو گے؟۔۔۔۔۔۔اور شوہر نے بیوی کی اس بے کار بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔۔

اور مولوی صاحب پیٹ پر ہاتھ پھیرنے اور ''فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ'' (اور تم خدا کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے) کی تسبیح با آواز بلند کرنے میں مصروف ہو گئے اور اب وہ سکون سے قیلولہ فرما سکتے تھے اور بیوی ان کے حلق سی نکلی عربی الفاظ کی تسبیح سے دل میں تشویش کی بجائے عقیدت محسوس کرنے لگ گئی" ماشااللہ مولوی صاحب نے کیسی حسین آواز اور تلفظ پایا ہے"۔

اور شوہر تو ویسے ہی مولوی صاحب کا احسان مند ہو گیا تھا، کیوں نہ ہوتا آخر انہوں نے حرام بیوی کو حلال کرنے کا طریقہ بتا کر اس کے گھر کو ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچا لیا تھا۔
اس کے دل نے بھی خاموشی اور سرشاری سے کہا: ''فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ''

نیا جنم

گود میں پڑے سیل فون کی گھنٹی بجی تو میرے پورے جسم میں ارتعاش پھیل گیا، نامعلوم نمبر تھا۔سوچا گاڑی چلاتے ہوئے اٹھاؤں یا نہیں ۔ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ انگلی فون کے سپیکر پر دب کر اسے آن کر گئی ۔ہیلو! میرے منہ سے جیسے ہی نکلا دوسری طرف سے انتہائی پنجابی جٹ لہجے میں اردو بولتی کھردری سی آواز نے انتہائی غصے میں مجھ سے پوچھا۔
" آپ سیمی ہو جی؟؟"

"جی جی۔۔" میں نے سگنل پر بریک لگاتے ہوئے کہا۔

"بھاگ گئی کسی یار کے ساتھ ،حرامجادی اس کا اپنا تو منہ کالا ہی تھا ہم سب کا بھی کر گئی۔" آواز نے کسی لحاظ کے بغیر اپنا مدعا بیان کیا۔

" کون بھاگ گئی ،کہاں بھاگ گئی ،کون ہیں آپ؟" میرا دھیان پچھلی سیٹوں پر بیٹھی اپنی بیٹیوں کی طرف گیا وہ پنجابی، اردو گالیوں کو شائد نہیں سمجھتی تھیں،مگر موسیقی کی طرح گالیوں کی بھی کوئی زبان نہیں ہوتی اسی لئے جب میں نے بیک ویو مرر سے ان کے چہروں کا رنگ بدلتے دیکھا تو فون کا سپیکر بند کیا اور کانپتے ہاتھوں سے اسے کان کے ساتھ جوڑ دیا۔

" آپ بھولی نہ بنیں جی ،آپ تو اس کی رب ، بھگوان ، وائے گرو ،سب ہیں نا جی ،آپ کی تو آرتی اتارتی تھی"، لہجے کی کاٹ میرے کان تو کاٹ ہی رہی تھی مگر معاملے کی

تہہ تک پہنچتے ہی میرا کلیجہ بھی کٹ گیا۔۔ امرت کور؟ یہ نام خون کے قطرے کی طرح میرے اندر کہیں گرا۔" دلجیت سنگھ ہیں آپ؟" میں نے آواز کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اور کون ہوسکتا ہوں میں؟ یہ بھی چھڈ دیں جی میں کون ہوں یہ بتائیں وہ کتھے گئی؟" آواز میں ترشی بڑھتی جارہی تھی۔

"ابھی تم مجھے اطلاع دے رہے ہو کہ وہ بھاگ گئی، میں تمھیں کیسے بتاؤں وہ کتھے گئی۔۔" غصہ میرے رگ وپے میں پھیلنے لگا۔

"نہ بتائیں جی، پولس میں رپورٹ کردی ہے، مگر آپ اسے یہ جرور بتادیں جس دن ہتھے چڑھ گئی، اس کی نک وڈ دینی ہے اور اس کے یار کی تون (گردن)۔"

"یہ کینیڈا ہے دلجیت سنگھ تمھارا پنجاب نہیں۔۔" غصہ اور غم اب مجھے پورا نگل چکا تھا، "اس کی ناک کاٹو گے تو پولیس تمھارا گلا کاٹ دے گی۔" میں نے اپنی طرف سے اسے دھمکانے کی کوشش کی۔

اب میں گاڑی بچوں کے سکول کی پارکنگ میں کھڑی کئے ساکت بیٹھی تھی۔ میری دونوں بٹیاں نہ جانے کب مجھے بائے بائے کر کے کینیڈا کی آزاد اور پرسکون فضا میں شامل ہوچکی تھیں۔ اور میں کینیڈا کی اسی فضا میں گاڑی پارک کرنے کے باوجود اس کی تازگی اور آزادی اپنے اندر نہیں اتار سکتی تھی۔ میری گاڑی کے شیشے بند تھے اور میں اندر سے پنجاب سے آلودہ ہورہی تھی۔

اندر سے وہ پوری رنڈی تھی، کسی کوٹھے کا بیج تھی، غلطی سے شریف گھر میں پیدا ہوگئی اور اس سے بھی بڑی غلطی، مجھ جیسے شریف گھرانے کے آدمی سے بیاہی گئی۔۔ اب دلجیت کے انداز میں پراپگینڈہ کی وہ پلاننگ تھی جو اس کے پورے خاندان نے بیٹھ کر کی ہوگی کہ

اس خبر کو پھیلانا کیسے ہے۔

شریف آدمی تمھیں آج نظر آیا کہ وہ بھاگ گئی۔؟ وہ تو نہ جانے کتنی دفعہ بھاگ گی ہے۔۔ میرا دل کررہا تھا کہ اس سے بھی زیادہ کوئی سخت بات کروں جس سے اس کی غیرت کہیں کی نہ رہے مگر اس سے زیادہ نہ مجھ میں کچھ کہنے کی ہمت تھی نہ اسکی بکواس سننے کی لہٰذا میں نے فون بند کردیا۔ اپنا سر سیٹ کی بیک پر پٹک دیا۔۔ اور جب بند آنکھوں کے پیچھے گھٹن اتنی بڑھ گئی تو ان کے کناروں سے خاموش پانی اپنا راستہ بناتا باہر نکلنے لگا، گھٹن تو یہ بے جان، ننھے ننھے قطرے نہیں برداشت کرسکتے اور بہہ جاتے ہیں وہ تو پھر پوری جاندار اور متحرک عورت تھی۔

"میں ہوں پنجاب کی پوری جُٹی" اس کے ساتھ ایک انتہائی زندہ اور خالص قہقہے نے میرے اندر ایک ہلچل مچادی تھی۔ کینیڈا کی سرد، دوغلی، اور ماڈرن زندگی میں پینٹ شرٹ، لانگ شوز پہنے، پنجاب کی اس جُٹی نے مجھے سات سال پہلے مجبور کردیا تھا کہ میں اس کے چہرے کی یک رنگ کو غور سے دیکھوں۔

میں نے اسے کہا "امرت کور یہ کینیڈا، یہ پینٹ کوٹ تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکا تم سر پر لسی کی چاٹی رکھو، ہاتھ میں ساگ اور مکئی کی روٹی کی پوٹلی اٹھاؤ اور نکل جاؤ کھیتوں میں اپنے دلجیتے کو کھانا کھلانے"

"ہو ہائے۔۔ لے دسو۔۔" اس کے ساتھ وہ مجھ سے بڑی پیاری انگریزی میں بات کرنے لگی تھی۔۔

"نہ نہ میں نے ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے کہا تھا۔۔ still i am not impressed۔۔ امرت تمھارا جالندھر نہیں مرا نہ تمھارے اندر تو رہنے دو مت مار واسے، اپنے اس ایک چہرے کی خوبصورتی اور قدر تمھیں نہیں پتہ تو مجھ سے پوچھو میں بتاؤں گی۔۔"

"سیمیں جی! تسی مینوں چنگے لگدے او، کیوں؟ اس کا کارن؟ مجھ سے پچھو۔۔" اس کی خوبصورت آنکھوں میں شرارت کی پھلجڑی چلی۔

"دسو۔۔" میں نے اسی کے انداز کی نقل کرتے ہوئے کہا تھا۔۔

"آپ ابھی تک ایک منہ والے لوگوں کی پچھان رکھتے او، اور ان کی قدر کرتے ہو، ورنہ مجھ نکمی کو کون منہ لگاتا ہے، آپ میں کچھ ہے بھگوانوں جیسا، میں لاکھ نکمی سہی لیکن صاف دل والوں کو پچھان لیتی ہوں۔ آپ میری سہیلی بن جاؤ۔ بس!" اس نے اعلان والے انداز میں کہا تھا۔

میں ہنس پڑی۔۔ "یہاں کس کو وقت ہے سہیلی بننے کا مگر میں تمھاری سہیلی ہی ہوں۔۔"

"میری سسٹر بن جاؤ۔۔ اس نے میری گردن کے گرد باہیں ڈال کر مجھے چمٹتے ہوئے کہا۔۔"

اچھا اچھا، اب میری ایکدم سے اتنی پرموشن نہ کرو" میں نے ہنستے ہنستے اس کے بازو اپنی گردن سے جدا کرنے کی کوشش کی۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کے بازو میری گردن کے گرد اور کستے گئے ,ملنے ملانے کا وقت نہ اس کے پاس ہوتا نہ میرے پاس۔ مالٹن اور ملٹن کے شہروں میں فاصلے تھے مگر فون کی تاروں نے ہمیں آپس میں باندھ رکھا تھا۔

پھر ایکدم وہ غائب ہوگئی، کوئی رابطہ نہیں، دو سال ایسے ہی گذر گئے۔ آج بچوں کے سکول کی پارکنگ کے باہر کھڑی ہوئی میں سوچ رہی ہوں مجھے ان دو سالوں میں ایک دفعہ بھی خیال نہیں آیا کہ وہ کسی مصیبت میں ہوگی۔ میں اپنی زندگی کی الجھنوں کو سلجھانے میں اور اپنی ذات کو بچانے کے چکر میں ارد گرد سے ویسے ہی بیگانہ ہوتی جا رہی تھی۔ پھر بھی کبھی

کبھار روٹین میں اس کا نمبر ڈائل کر دیتی ,نمبر بند ملتا۔ اور اس کے بعد میں کچھ اور میں مصروف ہوجاتی اور پھر ایک دن اچانک اس کا فون آ گیا۔ اور اس کی آواز سنتے ہی مجھے احساس ہوا کہ یہ تو بہت دنوں بعد فون کر رہی ہے، میں نے اسے موقع دیئے بغیر فوراً گلے شکوؤں کی دکان کھول دی، وہ پہلے یہ شٹر گرانے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر ایکدم رو پڑی، میں بولتے بولتے چپ ہوگئی یہ سسکیاں کہاں سے ابھر رہی ہیں۔ اگر دوسری طرف امرت کور ہے تو اب تک قہقہہ کیوں نہیں سنائی دیا۔ امرت؟؟ میں نے سہمے سہمے پوچھا۔ تم رو رہی ہو؟

آنسوؤں، ہچکیوں، بار بار فون بند کرنے کے بعد مجھے بات کچھ اس طرح سمجھ آسکی کہ وہ معاشی پریشانیوں کا بہت برے طریقے سے شکار رہی تھی۔ اس کے شوہر نے اپنے آپ کو بھی اور اس کو بھی بنک کرپٹ کروا دیا تھا، اس کے علم کے بغیر اس کے نام کی کریڈٹ لائنز لے لی تھیں، امرت کے کریڈٹ کارڈ استعمال کر لئے تھے، اس کے 3600 سکوئر فیٹ والا گھر اور اس کی مرسڈیز، کچھ بھی اب اس کے پاس نہیں تھا۔

یہ دھوکہ صرف پیسے کا ہی نہیں تھا، اعتماد کے رشتے کا خون ہو چکا تھا۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اس رشتے میں اب عمر بھر کی بے یقینی مقدر بن گئی ہے اور معصوم اور مخلص، اعتماد کرنے والی لڑکی اپنا یہ ہنر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو چکی ہے۔

پھر ایکدن جب وہ ہڈیاں ابھرے چہرے کے ساتھ پرانی، زنگ آلود کرولا میں مجھ سے ملنے آئی تھی تو میں نے اسے کہا تھا میری پنجاب کی جٹی کہاں ہے؟

اس نے ہنسنے کی کوشش میں روتے روتے میرے گلے لگتے ہوئے کہا" وہ اب کرائے کی بیسمنٹ میں دھیرے دھیرے دفن ہو رہی ہے، سیمیں جی ہم لوگ مردے جلاتے ہیں مگر سکھوں میں اب نیا رواج پڑنے والا ہے زندہ مردوں کو دفنانے والا۔۔"

"مالی مسائل سے اتنا نہیں گھبراتے، یہ شکر کرو تمھارے بچے، تم اور تمھارا شوہر سب صحتمند ہیں"۔ میں نے ٹشو سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

"بچوں کو رب جندگی دے، مگر میں جینا نہیں چاہتی۔" امرت کے آنسو ٹشو بھگوتے جارہے تھے۔۔

"صرف اس لئے کہ تمھارا بڑا گھر اور نئے ماڈل کی گاڑی نہیں رہی؟"

"یہ بات نہیں ہے۔۔" وہ ایک طرف گم سم سی دیکھتی جارہی تھی۔

"تو کیا کولیکشن ایجنسیوں کی کالز نے تمھارے اعصاب متاثر کر دئے ہیں اور اس کے بعد بنک کرپٹ ہونے کی ذلت؟ کیوں موت کی بات کر رہی ہو؟ کیوں ہنسنا بھول گئی ہو؟ میں اس کے ہاتھ سہلا رہی تھی مگر وہ موت کی طرح ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

"وہ مجھے چھڈ کر چلا گیا تھا جس نے میری رکھشا کی جمہ واری اٹھاتے ہوئے کہا تھا ساری جندگی میری حفاظت کرے گا وہ کائیر پیسے کی تنگی میں مجھے فنسا کر اپنے ماں باپ کی بکل میں گھس گیا تھا، سارا کچھ سہ سکتی تھی، اپنے ساتھ کھڑا کر کے شڑک پر بھیگ مانگنے کو کہتا وہ بھی کر لیتی، پر مجھے کلا کر گیا، یہ بات نہیں جہن (ذہن) سے نکلتی بس فنس سی گئی ہے، سیمی جی اب واپس بھی آ گیا ہے مگر اس وقت کو کیسے بھولوں جب میں اپنے ماں باپ اور بھائیوں سے پیسے منگ منگ کے ان مسئلوں سے نکلی تھی، گراسری تک میری ممی میرے ساتھ جا کے کرتی اور جب پیسے دینے کی باری آتی تو میں بے شرموں کی طرح اپنی بوڑھی ممی کو اپنے پنشن کے پیسوں سے بل دیتے دیکھتی اور اپنی گیلی اور بے شرم آنکھیں ادھر ادھر کر دیتی، اس سب نے مجھے مار دیا ہے اور اب میں جندہ تو نہیں، ایک جیوندی جاگدی لاش آں، بچوں کو جب کچھ ترو کے اتنے بڑے گھر سے بیسمنٹ میں لا کر فینکا تو میرا چھوٹا بہت بلک بلک کے رویا تھا اور وڈے نے کہا تھا ماما اب میں اپنے دوستوں کو گھر نہیں لا سکتا، میں تھاہ مر گئی سیمی

جی، ان بچوں نے ہمیں چٹھی نہیں ڈالی تھی کہ ہمیں پیدا کرو۔ ہم نے انہیں پیدا کیا اور اب یہ ذلت بھری زندگی دی انہیں؟ یہ سب باتیں بھی بھول سکتی ہوں مگر مجھے کلم کلی کو چھڈ گیا، یہ بات ذہن سے نہیں نکلتی۔۔ میرا ٹشو پیپر آنسوؤں سے بھر گیا مگر اب اس کی آنکھیں آنسوؤں سے خالی تھیں، ان کے اندر دھوکے اور زخم نظر آ رہے تھے۔

یہ زخم بھی ذہن سے نکالنے کی کوشش کرو، زندہ ہو تو پھر زندہ رہ کر ہی جئو، امرت مردے زیادہ دن سپورٹ لائف پر نہیں جی سکتے۔ کوئی بھی ان کی سپورٹ ختم کر دے تو بس کہانی ختم۔۔ میں نے کمزور سی آواز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

اور یہ دلجیت سنگھ سمجھ رہا ہے وہ آج بھاگی ہے۔۔ ہاہا۔۔ وہ تو اس دن ہی بھاگ گئی تھی جب وہ اسے مالی پریشانیوں سے گھبرا کر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ دلجیت نے سمجھ لیا کہ وہ واپس آ گیا اور وہ پھر سے اکٹھے ہو گئے؟ س ناقص عقل نے یہ نہ دیکھا کہ جب وہ واپس آیا تو امرت کور تو وہاں تھی ہی نہیں۔

وہ اسے اپنے ساتھ بٹھا کر باتیں کرتا، اس کے ہاتھ کا پکا کھانا کھاتا، اور رات کو اس کے ساتھ جب سوتا اور سرشاری کے انتہائی لمحے میں کہتا "رب دا شکر ہے اسی فیر اکٹھے آں" اور وہ اس کی فراغت کے بعد اسے دھکا دے کر پیچھے کرتی، بھاگ کر شاور کے نیچے جا کر کھڑی ہو جاتی اور اپنا جسم مل مل کر دھوتی اور اگلے دن مجھ سے کہتی،

"اچھا اب میں ایسا نہیں کہتی کہ میں مر جاؤں مگر سیمیں جی کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں صرف "اُن پندرہ منٹوں" کے لئے مر جاؤں"۔ میں ڈانٹتی تو بڑے درد سے کہتی "اچھا پندرہ منٹوں کے لئے بھی نہیں مرتی مگر کیا بے ہوش ہو سکتی ہوں؟"

میں اسی کار پارکنگ میں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے پتھر کی ہو گئی ہوں۔

ہوں!! پھر بھی ہنکارا بھرتی ہوں، " تو دلجیت سنگھ کو نظر آ گیا کہ وہ بھاگ چکی ہے"

میں نے تو اس کے بھاگنے کی آواز اس وقت بھی سنی تھی جب ایک دن میں نے اسے کال کی تو فون اٹھاتے ہی بولی تھی:

"سیمی جی اس وقت فون کیوں کیا؟"

" کیوں اس وقت کیا ہے؟ میں اس کے انداز سے چونکی۔

"میں اپنا کام کر رہی تھی" اس کی آواز میں سرشاری تھی۔۔

"اپنا کام؟ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی وہی کام، جو وہ کتا رات کو میرے ساتھ کرتا ہے.

میں خوفزدہ ہو کر بولی،" کون ہے تمھارے ساتھ۔۔؟

اس کا وہی پنجابی قہقہہ ابھرا۔۔

" کوئی تو ابھی ڈھونڈ رہی ہوں۔ فی الحال میں خود کافی ہوں اور اب پتہ چلا انسان یہ کام کیوں کرتا ہے "

مجھے کراہت سی محسوس ہونے لگی تھی، میں نے کیوں کا جواب بھی نہ پوچھا، وہ خود ہی بول اٹھی:

"جب انسان کا اپنے ساتھ سے اعتبار اٹھ جاتا ہے"۔

جس کام سے فون کیا تھا وہ بتائے بغیر میں نے فون بند کر دیا, اس کے بعد بہت دنوں تک میں نے اس سے رابطہ نہ کیا۔ وہ مجھے فون کرتی تو میں جان بوجھ کر یا تو فون اٹھاتی ہی نہیں تھی اور جب اٹھاتی تو ہیلو کہتے ہی کہہ دیتی کہ میں مصروف ہوں دوبارہ کرتی ہوں اور پھر کبھی نہ کرتی تھی۔۔

پھر ایک دن اس کا مجھے سیل فون پر ٹیکسٹ آیا کہ "میں نے آپ کو اپنا بھگوان، خدا ،رب سب کہا تھا اس کا یہ مطلب نہیں کہ جیسے وہ ہماری نہیں سنتے آپ بھی میری سننا چھوڑ دو

،آپ اب میری ماں، باپ،،بہن، بھائی اور دوست سب کچھ ہو، دیوتاؤں کے جوتوں سے نکلو، ان دنیاوی رشتوں میں گھسو اور مجھے دیکھو میں بہت تکلیف میں ہوں۔"

میرے اندر کا جج اس پیغام کے بعد ایک دم ڈھیلا پڑ گیا، میں نے اسی وقت اسے فون کیا اور جھوٹے سچے مصروفیت کے بہانے لگانے کے بعد اس کا حال چال پوچھا۔۔

دو خوشخبریاں ہیں۔۔اس نے چہکتے ہوئے کہا۔

"تمھارا تو میسج تھا کہ تم تکلیف میں ہو" میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے مصنوعی غصے سے کہا۔

"جس چیز کی عادت نہ رہے وہی تو تکلیف دیتی ہے"۔ پتہ نہیں اتنی گہری باتیں اسے کب کرنا آ گئی تھیں۔

"خوشخبری نمبر ایک: اب کتا میرے پاس رات کو کم کم, بلکہ نہ ہونے کے برابر آتا ہے اور پھر وہی پنجابی قہقہہ مارتے ہوئے بولی,

"ٹائلٹ میں گھنٹہ گھنٹہ لیپ ٹاپ لے کر گھسا رہتا ہے, اچھے حالات ہوتے تو میں آپ کو کہتی لیپ ٹاپ میری سوکن بن گیا ہے مگر اب تو میرے لئے کیا آپ کہتی ہو "رحمت, ہاں رحمت "بن گیا ہے"۔

خوشخبری نمبر دو: مجھے ایک صحیح پنجاب کا غیرت مند، ذہین گھبرو جوان مل گیا ہے اور اب اس کے ساتھ کی وجہ سے آپ کی پنجاب کی جُٹی کا revival ہو جائے گا یعنی "جُٹی کی واپسی ۔ہاہاہاہا"، میں نے بہت عرصے بعد اس کا خالص قہقہہ سنا اور مجھے سمجھ نہ آئی ان دونوں خوشخبریوں پر میں کیا ردِعمل ظاہر کروں، میں نے چہرے پر فقط مسکراہٹ گھسیٹتے ہوئے پوچھا,

" تو کیا تم دلجیت سنگھ کو چھوڑ رہی ہو؟

"لے دسو!! بچوں کو رول دوں؟ کیا سوچیں گے پہلے باپ بھاگ گیا اب ماں چھڈ

گئی، پھر آپ کو تو پتہ ہی میرے اپنے بھائی اور ماں سب سے پہلے انہوں نے شور مچانا ہے اور کہنا ہے ساڈی نک کٹ گئی، میرا ساتھ کون دے گا، نہ جی اس کو اسی طرح ساتھ رکھنا ہے اور اب بس میں نے دوغلی بن جانا ہے پھر ایکدم اسے کچھ یاد آ گیا اور چونکتے ہوئے بولی آپ کو تو میرا ایک چہرہ پسند تھا نا اسی وجہ سے آپ نے دھرم کو درمیان میں لائے بغیر مجھ سے دوستی کی تھی، آپ مجھے چھوڑ تو نہیں دو گی؟ "رب دے واسطے آپ مجھے کبھی نہ چھوڑ نا۔"

"رب دے واسطے آپ مجھے کبھی نہ چھوڑ نا۔" مجھے ایکدم لگا امرت کے یہ الفاظ پارکنگ ایریا میں چیخ رہے ہیں اور میرے ہاتھ سٹیرنگ کے اوپر بے جان سے ہو گئے، سمجھ نہیں آ رہا تھا اس ذہنی کیفیت میں گاڑی چلا کر گھر کیسے جاؤں گی۔۔

وہ بھاگی تو بہت دفعہ تھی، کبھی بچوں کے لئے، کبھی ماں باپ کے لئے، کبھی بہن بھائیوں کے لئے، کبھی کمیونٹی کے لئے وہ بھاگی ہوئی نظر نہ آتی تھی، اپنے بھاگنے کو چھپانے کے لئے اس نے دوغلا پن اپنا لیا تھا مگر اب وہ کیوں ایسے بھاگی کہ نظر آ گئی، سنائی دے گئی، محسوس ہو گئی۔۔کیوں؟؟؟؟؟؟؟؟

"وہ اندر سے رنڈی تھی جی" دلجیت کے الفاظ سوئے ہوئے بھی میرے کان میں گونجے تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، ساتھ لیٹے ہوئے اپنے شوہر کے بازو پر سر رکھ کر اس کے سینے کے ساتھ دبک گئی۔

" کیا رنڈی میری دوست تھی؟ وہ جاگ گیا تھا، اس نے مجھے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا میں تو تمھیں پہلے ہی کہتا تھا سکھ عورتیں اور طرح کی ہوتی ہیں اور یہ تو کچھ زیادہ ہی۔۔۔میں نے بات پوری ہونے سے پہلے دھکے سے اسے اپنے سے پیچھے کر دیا، اور چلائی:

"نہیں وہ صرف جینا چاہتی تھی، وہ عام سی زندہ عورت تھی، قہقہہ مار کر ہنسنا، اپنی مرضی کے کپڑے پہننا اور بارش میں ناچنا چاہتی تھی، کہہ لو بس اپنی زندگی کو زندوں کی طرح،

اپنے دل کے حساب سے جینا چاہتی تھی مگر یہی اس کا جرم بن گیا سب اسے مارنے کی مسلسل کوشش میں لگے ہوئے تھے مجھ سے بات مکمل نہ ہو سکی اور میں روتی روتی اپنے کمرے سے نکل کر اپنی بیٹیوں کے کمرے کی طرف بھاگی۔

میرا شوہر بھی میرے پیچھے پیچھے آ گیا کیونکہ اس کی نیند اکھڑ گئی تھی" واپس کمرے میں آؤ"

"نہیں آتی" میری رگیں تن گئیں،

وہ منت سماجت پر اتر آیا، میں ڈٹی بیٹھی رہی اور آخر کار جب بچیاں نیند سے ڈسٹرب ہونے لگیں تو اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ غصے سے چلایا،

"بدکردار عورتوں سے دوستی رکھو گی تو میری بیٹیوں پر بھی اثر پڑے گا تم جاؤ جہنم میں"۔۔وہ اپنی شکست کو اپنے تئیں پیروں تلے کچلتا اور مجھے دانتوں میں کچکچاتا چلا گیا۔

امرت کور جب مردہ حالت میں میرے پاس آئی تھی تو میں اس کے جنازے کی چارپائی اکیلے نہیں اٹھا پائی تھی اور اس رات میں نے اپنے شوہر کو اس کے بارے میں سب بتا دیا تھا۔اس وقت اس نے مجھے سمجھایا کہ امرت سے دور رہو ایسی مسائل زدہ عورتیں، نفسیاتی مسائل کا شکار ہوتی ہیں، تم پر چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی اثر ہو جائے گا اور میں اس کے بعد جب بھی امرت کور کی کوئی بات سنتی، چاہتے یا نہ چاہتے میرے دل میں شوہر کی طرف سے دی ہوئی وارننگ کا الارم بجنے لگتا تھا اور میرے اندر بیٹھا جج اپنا ہتھوڑا لئے حدِ ادب حدِ ادب کہتا میز بجانے لگتا۔کیا میں امرت کور کو سنگسار کرنے والوں میں انجانے طور پر شامل ہو چکی تھی؟

اس کا جواب مجھے دو دن بعد مل گیا۔امرت کور پڑھی لکھی ہونے کے باوجود کمپیوٹر کو استعمال کرنے میں ہمیشہ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتی تھی۔مگر آج میرے ان باکس میں اس کی

طرف سے آیا ہوا پیغام جگمگا رہا تھا۔ میں نے بے تابی سے اسکی ای میل کھولی، رومن اردو میں تھی، جسے وہ ہندی کہتی تھی۔۔

سیمیں جی! نمستے!

مجھے پتہ ہے اب تک آپ کو میرے بھاگنے کی خبر جرور مل گئی ہوگی کیونکہ گھر چھوڑنے سے پہلے جو پورا ہفتہ تھا دلجیتا آپ کو بہت کوسنے دینے لگ گیا تھا، وہ سمجھتا تھا کہ اس کے ساتھ جو موت جیسا ٹھنڈا اور خاموش ایگرمنٹ اور اپنی ذات پر توجہ دینے کا جو کام میں نے شروع کیا ہوا ہے وہ آپ نے مجھے کوئی پٹی پڑھائی ہے کیونکہ چاہتے نہ چاہتے ہر بات میں آپ کا نام میرے منہ سے نکل جاتا تھا۔ میرے لئے تو جی سب کچھ آپ ہی تھی نا، میں کوئی بات چھپا نہیں سکتی، جتنی بھی دوغلی ہو جاؤں، پھر بھی پیٹ کی ہلکی ہی رہوں گی۔ پہلے اس کے سامنے کھلی کتاب کی طرح تھی مگر جب اس کے سامنے میں نے اپنے سارے ورقے سمیٹ لئے تو پھر آپ میری بھگوان بن کر میری زندگی میں آ گئیں۔ جب میں اللہ یا بھگوان کہتی تو کہتا ہندو یا مسلی ہو جا، سکھ دھرم میں تیرے جیسی جاتی کا کیا کام، رب کی جگہ آپ میری بات سنتی تھی، مجھے آپکا بڑا سہارا ہو گیا تھا جی، ویروار کو پتہ ہے نہ میں ورت (اپواس) رکھتی ہوں، اس دن بھی ویروار تھا، اس نے جیادہ ہی پی لی۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر مجھے مارنے لگا میں اپنے آپ کو بچانے لگی، پھر بھی کچھ سخت چیز سر پر لگی اور خون بہنے لگا میں اپنا خون دیکھ کر ڈر گئی کملیوں کی طرح یہاں وہاں بھاگنے لگی، اسی وقت بیسمنٹ کی سیڑھیوں سے مجھے اپنے ممی ڈیڈی اور بھائی اترتے نظر آئے اور میں بھاگ کر ان کو چمٹ گئی، ممی نے ایک لمحے میں مجھے سینے سے لگا لیا۔۔ میں نے امید بھری نظروں سے انہیں دیکھا اور کہا ممی مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا، ڈیڈی اور بھائی نے کھینچ کر مجھے ممی کے سینے سے الگ کیا اور کہا، "شریف کڑیاں گھر بساتی ہیں", ہماری ناک کا سوچ اپنے چونچلوں کا

نہیں، نبٹ، یہاں رہ کے نبٹ۔" اور دونوں میری ممی کو درمیان میں گھسیٹتے ہوئے واپس لے گئے، اس دن میں نے آپ کو رب کے ساتھ ساتھ اپنا پریوار بھی بنا لیا تھا اور آپ کو نہ بتانے والی باتیں بھی بتانے لگی۔

ادھر پرویندر سے دل لگا لیا، ایسا لگنے لگا وہ میرا کیا کہتے ہیں soul mate ہے یا مجھے اس غم سے نکالنے والا وہی ایک بندہ ہے، میرا یہ ناجائز رشتہ آپ کو پسند نہیں آیا تھا اور آپ مجھے منع بھی نہ کرتی تھیں لیکن آپ کی آنکھوں کا بدلتا رنگ مجھے سمجھ میں آتا تھا، آپ میرے ساتھ چپ ہو گئی تھیں۔۔ میں لئے آپ کی چُپ سہنا بڑا عذاب تھا، لیکن میں نے وہ بھی سہہ لیا۔ آپ کی چپ بھی مجھے کہنے لگی "ہُن آپ نبٹ"۔

اور پھر آخیر اس دن ہو گئی جس دن سیمیں جی میرے اٹھارہ سال کے بیٹے نے چھوٹے بیٹے کے سامنے مجھے دھکا دے کر زمین پر گرایا اور کہا، "آ لینے دے پاپا کو بتاتا ہوں تو فون پر کس سے دانت نکال نکال کر باتیں کرتی رہتی ہے" اور میرے ہاتھ سے میرا فون کھینچ کر میرے سر پر دے مارا اور کہنے لگا ماما اس سے اچھا تم مر جاؤ"۔

تو مجھے لگا یہ بات آپ کو بھی بتائی تو آپ کی چپ اور بڑھ جائے گی بس پھر میں اس دن چپ چپیتے پچھلے سارے دروازے بند کر کے پرویندر کے پاس آ گئی اور اس کے سامنے اپنے پیٹ سے کپڑا ہٹا دیا۔۔

اس نے بس اتنا کہا "امرت میرے بال بچے ہیں, پورا پریوار ہے، پر تیرا دکھ سمجھتا ہو, تجھے کلا نہیں چھوڑوں گا, یہاں ایک اپارٹمنٹ لے دیتا ہوں تیرے پاس گڈی ہے، تو یہاں, موج کرنا میں تیرے پاس آتا جاتا رہوں گا۔"

اب میں یہاں مانٹریال آ گئی ہوں، سیمی جی یہ بات کسی کو نہ بتانا، آخری دفعہ آپ کو اپنے گندے کرتوتوں کا ہم راز بنا رہی ہوں۔۔ دلجیتا کہتا تھا، میں رنڈی تھی غلطی سے شریف گھرانے میں پیدا ہو گئی تھی اور شریف گھر میں بیاہی گئی تھی۔ سیمی جی دنیا، میرا کھاندان

، بچے جو بھی سمجھتے رہیں بس آپ اتنا جان لو کہ میں پہلے رنڈی نہیں تھی مگر اب ہو گئی ہوں۔ اس سے زیادہ لکھا نہیں جا رہا، میں آپ کی دوستی کے قابل نہیں رہی، معاف کر دینا اور اپنا بہت جیادہ خیال رکھنا۔۔"

میں نے ای میل پڑھ کر جلدی سے ڈیلیٹ کر دی اور پھر ڈیلیٹیڈ آئیٹمز میں جا کر پھر ڈیلیٹ کر دی کہ کہیں میرا شوہر نہ پڑھ لے، اس خوف سے امرت کو میں نے کھرچ کھرچ کر اپنے ان باکس سے نکال دیا اور لیپ ٹاپ بند کیا اور اپنے ساتھ لیٹے ہوئے شوہر کے کندھے کو آہستہ سے سے ہلا کر پوچھا،

" کیا امرت کور بدکردار تھی؟

اس نے کتاب بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور خمار بھری آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بڑے پیار سے کہنے لگا،

" نہیں وہ بس زندہ رہنا چاہتی تھی"

میں چلائی، "سجاد تم جھوٹ بولتے ہو، وہ رنڈی تھی۔۔"

اس نے تمسخرانہ انداز سے کہا" نہیں یار وہ بس بارش میں رقص کرنا چاہتی تھی"

پھر ایکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا" اب تم پھر نہ بچوں کے کمرے میں بھاگ جانا، میں ایک فضول عورت کے لئے اپنے بیڈروم میں یہ روز روز کا تماشا نہیں برداشت کر سکتا"

یہ کہہ کر اس نے غصے سے لیمپ بند کر دیا اور میں نے اندر ہی اندر پوری قوت سے چیختے ہوئے امرت کور سے پوچھا،

" کیا کوئی ایسی موت ہوتی ہے جو صرف پندرہ منٹ کے لئے آ جائے، اچھا موت نہ سہی بے ہوشی ہی سہی۔؟

اور مانٹریال کے سرد علاقے کی طرف سے اس کا جواب آیا،

" سیمی جی میں پہلے رنڈی نہیں تھی۔۔ میں دوبارہ پیدا ہوئی ہوں۔"

تنہائی کے بیوپاری

تہمینہ بالکنی میں کھڑی آسمان سے گرتے روئی کے سفید پھولوں کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے آسمانوں کے پار سے اس کی تنہائی دور کرنے بہت سے دوست اور رشتے دار اکٹھے ہو کر آ رہے ہوں۔ انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر اس کا دل خوشی سے باغ باغ ہو رہا تھا، اس نے مسکرا کر انہیں خوش آمدید کہا اور جب وہ اس کے پاس پہنچے تو اس نے ہاتھ بڑھا کر ان کے لمس کو محسوس کرنا چاہا مگر وہ برف کے پھول ٹھنڈے ٹھار تھے، اس کے ہاتھ کی گرمی میں آتے ہی پانی پانی ہو گئے اور جو اس کے ہاتھ کی پہنچ سے دور تھے وہ زمین کی طرف لپک گئے اور شدید سردی ہونے کی وجہ سے اس کے دیکھتے ہی دیکھتے پتھرانے لگے بالکل ایسے ہی جیسے تہمینہ کی اپنی زندگی دیکھتے ہی دیکھتے پتھرا گئی تھی۔

وہ کبھی اس برف کے پھول کی طرح تھی ٹھنڈی ٹھنڈی اور نرم سی، پیار کے ہاتھوں میں جھٹ سے پگھلنے والی مگر اب وہ ہاتھوں سے چھوڑ دی گئی تھی اور اپنی نرمی اور سفیدی کہیں پیچھے چھوڑ کر سڑک کنارے جمی ہوئی کالی برف کی طرح، اپنے اُن اچھے دنوں کی یاد میں گم رہتی تھی جب اس کا ایک اپنا بھرا پرا گھر تھا، جس میں نارمل گھروں کی طرح شوہر اور بچوں کی آوازیں گونجتی تھیں۔

کچھ سال پہلے جب وہ اپنی فیملی کے ساتھ سعودی عرب سے کینیڈا آئی تھی تو اس کا گھر خوشیوں غمیوں، لڑائیوں محبتوں، گلے شکووں سے بھرا ہوا ایک عام سا مگر ایک ہی سمت

میں دیکھنے والا گھرانہ تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ بکھر گیا۔بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شہر کچھ انسانوں کو راس نہیں آتے،ٹورنٹو بھی اس خاندان کے لئے شائد ایسا ہی شہر ثابت ہوا تھا۔

وہ اس نئے ملک میں اپنے آپ کو ڈھونڈنے میں ایسی مگن ہوگئی تھی کہ گھر کے باقی تین مکین کس سمت،کس وقت نکل گئے،اسے کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔ جب وہ اپنی ذات سے نکل کر ہوش میں آئی تو بہت دیر ہوچکی تھی۔اس کی بیٹی نے ہائی سکول کرتے ہی کسی ہندو سے ماں باپ کو یہ لالی پاپ دے کر کہ "لڑکے نے اسلام قبول کرلیا ہے" خاموشی سے شادی رچالی تھی۔

سعودی عرب میں گذارے گئے بچپن نے اس بچی کو اسلام کے قریب کرنے کی بجائے،اُس سے دور کر دیا تھا۔، خاص کر کے وہاں عورتوں پر لگائی جانے والی پابندیوں نے اسے مذہب کی گھٹن کا باغی بنا دیا تھا۔ وہ انتہائی چالاکی سے مذہب سے انحراف کے جذبات چھپا تو جاتی تھی،مگر حقیقت یہ تھی کہ کینیڈا آ کر جب اس نے یہاں عورتوں کی آزادی اور خود مختاری کے مزے لئے تو مذہب اسے بالکل ہی ایک بے جان اور کھوکھلی سی چیز لگنے لگ گیا۔اس لئے ماں باپ کی خاطر اس نے صرف کہنے کی حد تک کہہ دیا کہ لڑکے نے اسلام قبول کرلیا ہے حالانکہ اسکے" کہنے" سے نہ لڑکے کو فرق پڑتا تھا اور "نہ کہنے" سے نہ لڑکی کو فرق پڑتا تھا۔تہمینہ کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب وہ عورتوں کی آزادی اور خود مختاری پر ایک " آنکھیں کھول دینے" والا سیمنار اٹینڈ کر کے آرہی تھی اور ابھی راستے میں ہی تھی کہ اس کی بیٹی کی کال آگئی تھی کہ" ماما میں نے راہول سے شادی کر لی ہے۔"

بیٹی ماں باپ کے رویے سے سخت نالاں ہوچکی تھی اور گھر تو وہ کئی دنوں سے نہیں آرہی تھی اور اب مستقل نہ آنے کی وجہ بتا رہی تھی۔اس کے گھر چھوڑنے کا قصہ کچھ یوں تھا

کہ اس میں بھی اس کے شوہر نے بعد میں قصور تہمینہ کا ہی نکالا تھا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ ایک دن تہمینہ اور اسکا شوہر حسبِ معمول بہت بری طرح لڑرہے تھے اسے شکایت تھی کہ وہ اسے وقت نہیں دیتا۔سعودی عرب میں تو پارٹیاں اور شاپنگیں چلتی رہتی تھیں مگر یہاں نہ اس طرح کی پارٹیاں،نہ میل ملاپ اور نہ شاپنگ کے لئے پیسے۔۔وہ چلا رہی تھی:

"میں گھر میں سارا سارا دن کیا کیا کروں کیونکہ تمھارے پاس تو اب میرے لئے ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوتا،چلو وقت نہ دو، کھلے پیسے ہی دے دو تا کہ میں سعودی عرب کی طرح یہاں بھی شاپنگ کرتی رہوں،مگر اب تو وہ بھی نہیں ۔"

"جاؤ باہر جا کر انگلش کی کلاسیں لو، ان کے لئے تمھیں پیسوں کی بھی ضرورت نہیں،مفت کے سیمنار اٹینڈ کیا کرو۔یہاں کی عورت کو دیکھو،کماتی بھی ہے اور تم لوگوں کی طرح سر پر سوار بھی نہیں رہتی،تم لوگ تو پتہ نہیں کیا چاہتی ہو،خوابوں کی دنیا میں رہنے والی بے عملی عورتیں۔۔۔"

"تو اب میں تمھارے سر پر سوار ہوں؟اب میں بے عملی ہوں جب میں جاب کرنا چاہتی تھی تو تم کہتے تھے بچے چھوٹے ہیں اور اب۔۔"

"تب بچے چھوٹے ہی تھے،تمھاری ضرورت گھر کو ہی تھی،مگر تم سے تو وہ بھی ٹھیک سے نہیں ہوسکا،خود بھی بے لگام بچے بھی ہاتھ سے نکل گئی" شوہر نے غصے سے گلاس میز پر پٹکتے ہوئے کہا،شیشے کا گلاس تھا،اتنا غصہ سہہ نہ سکا اور ٹوٹ گیا۔بیٹی گھبرا کر کمرے سے نکل آئی،

"پاپا آپ ایسے گھر میں غل غپاڑہ نہیں کر سکتے،آپ ماما کو ڈرا دھمکا نہیں سکتے۔"

تب اس کی بیٹی نے حقوقِ نسواں پر اسکے ساتھ مل کر آواز اٹھائی تھی۔۔

یہ سنتے ہی باپ آپے سے باہر ہو گیا، بیٹی کو بھی خوب گالیاں دیں اور بچی اسی دن گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔۔

باپ نے بعد میں بڑی منتیں کی، فون پر سمجھایا بھی کہ،

"بیٹی میں اپنی اتنی اچھی نوکری چھوڑ کر یہاں تم لوگوں کی خاطر مزدوریاں کر رہا ہوں، سعودی عرب کی ساری جمع پونجی ادھر دھڑا دھڑ لگ رہی ہے، یہاں اتنی محنت کرتا ہوں، پھر بھی ایک پیسہ بچانا تو دور کی بات ہے روزمرہ کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں، اوپر سے تمھاری ماں کچھ سمجھتی ہی نہیں، وقت اور پیسہ مانگتی ہے، بتاؤ اس ملکہ عالیہ کے لئے کہاں سے لاؤں اب یہ دونوں سوغاتیں، بس اسی پریشانی میں تمھیں برا بھلا کہہ دیا، مجھے معاف کر دو اور واپس آ جاؤ۔۔"

"نہیں پاپا آپ اور ماما تو پہلے بھی ایسے ہی لڑتے تھے، میرا بچپن آپ کی لڑائیوں سے بھرا پڑا ہے مگر اب میں بڑی ہو گئی اور اور اگر بالغ ہونے کے بعد بھی میں اپنے لئے جہنم کا راستہ چنوں تو میں احمق کہلاؤں گی۔ جب تک میں بے بس بچی تھی وہ میری قسمت تھی مگر اب میں باشعور بالغ ہوں اب یہی غلطی کروں تو یہ میری بدقسمتی نہیں بلکہ بدعقلی ہوگی، اس لئے بہتر ہے کہ آپ لوگ مجھے معاف کر دیں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور ہاں آپ کو ہماری خاطر مزدوریاں کرنے کی بھی ضرورت نہیں، کم از کم میرے لئے نہیں۔"

اس دن کے بعد سے اس نے کبھی فون بھی نہیں کیا تھا اور پھر بس یہ فون جس میں اس نے اپنی ایک ہندو کے ساتھ شادی کا بم پھوڑا تھا۔

انسان مالی پریشانی کا پُل پار کر سکتا ہے مگر بچوں کی ایسی حرکتیں انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتیں۔ اور باپ کو تو یوں لگا جیسے عزت سرِ بازار نیلام ہو گئی ہو، جیسے اب وہ کبھی بھی اپنی پاکستان کی فیملی یا کمیونٹی میں منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوگا۔ اس بدنامی سے گھبرا کر وہ مزید

چڑچڑا ہو گیا اور اب وہ ہر وقت بچی کی غلط تربیت کا سارا الزام اس پر دھرتا رہتا تھا۔ وہ اسے ایک خودغرض اور ذات کی قیدی عورت سمجھنے لگ گیا تھا بیٹی کے اس طرح چلے جانے کے بعد وہ بھی شوہر کو کوسنے دینے سے باز نہ آتی تھی، اسے لگتا اب اس کے پاؤں میں نہ بچوں کی زنجیر ہے اور نہ اب کوئی کسر باقی رہ گئی ہے۔

جب وہ بیٹی کی تربیت کی بحث میں الجھے ہوتے تھے تو وہ بھول جاتے تھے کہ ابھی اس گھر میں ایک جوان بیٹا موجود ہے، اس کے سامنے تھوڑی دیر کو ہی خاموش ہو جائیں مگر عادتیں ایسے تھوڑی جاتی ہیں۔ سعودی عرب میں لڑائی کے دوران تہمینہ اکثر اپنے شوہر کے غصے کو نظرانداز کر کے خاموش ہو جایا کرتی تھی، یا لڑائی میں ہار مان کر جلدی سے معافی مانگ لیتی تھی۔ مگر اب تو اس کے اندر اپنے شوہر سے زیادہ غصہ بھر گیا تھا۔

"امی کم از کم آپ ہی چپ کر جایا کریں۔۔" ایکدن بیٹے کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا تھا۔

" کیوں میں کیوں چپ کروں؟ میں غلام ہوں اسکی۔۔ خریدا ہے اسنے مجھے؟

امی کے اندر حقوقِ نسواں کوٹ کوٹ کر بھر چکے تھے اب وہ کہاں خاموش رہنے اور کچھ سہنے والی تھی۔

"امی۔۔ خدا کے واسطے۔۔" بیٹا کانوں میں ہیڈ فون لگا کر غصے سے اپنے کمرے میں چلا جاتا تھا۔

اور پھر ایک دن وہ بھی ان دونوں کو یونہی لڑتے جھگڑتے چھوڑ کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس گھر سے چلا گیا۔ وہ اور اس کی گوری گرل فرینڈ دونوں یونیورسٹی کے ساتھ پارٹ ٹائم جاب کرتے تھے۔ یعنی دونوں خودمختار و خودکفیل تو کیوں ایسے جہنم میں رہیں؟۔

"امی میں نے اور شیرلی نے سوچا ہے کہ ہم اکٹھے رہیں گے۔ خرچہ بھی شیئر کریں

گے۔" اس نے بھی بہن کی طرح ماں کو صرف اطلاع ہی دی تھی۔

"ایسے ساتھ رہنا گناہ ہے بیٹے شادی کرلو۔"

اب تو اسنے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ لڑکی مسلمان نہیں صرف اتنا کہا کہ شادی تو کرلو۔۔۔

"وہ دیکھ لیں گے امی شادی کرنی ہے یا نہیں۔ گناہ ثواب کا نہیں پتہ مگر اس گھر کے جہنم سے دور ثواب نہ بھی ملے تو اذیتیں نہیں ہونگی یہ مجھے پکا پتہ ہے اور شادی سوچ سمجھ کے کروں گا تاکہ میرے بچے اس اذیت سے نہ گزریں جن سے ہم گزر رہے ہیں۔"

اور وہ ہکا بکا بیٹے کا منہ تکتی رہ گئی تھی۔۔

اس کے اور اسکے شوہر کے درمیان کبھی بھی انڈرسٹنڈنگ نہیں تھی۔ وہ جب جوان تھی اور آزاد پنچھی کی طرح اڑنا چاہتی تھی تو وہ خوفزدہ اور دقیانوسی خیالات کا آدمی اسے سعودی عرب میں مذہب کی اور ثقافت کی زنجیروں سے باندھ کر رکھتا تھا۔ اور اب جب وہ درمیانی عمر میں تھی تو کینیڈا لا کر کہہ رہا تھا کہ سیمنار اٹینڈ کرو اور مغرب کی عورتوں کی آزادی اور خوداعتمادی کی مثالیں دے رہا تھا۔ اب اسے وقت کے ساتھ بھاگنے کا حکم مل گیا تھا۔ نہ بھاگتی تو گھر کے کونے میں پڑا ہوا ایک ناکارہ سامان ہوتی۔ اس ڈھونڈ میں اور بھاگم دوڑ میں بچے تو گھونسلے سے پھُر کر کے اڑ گئے اور وہ شوہر کی خواہش کی تکمیل میں نہ چاہتے ہوئے بھی بھاگنے لگی۔

بچوں کی زنجیریں بھی جب پاؤں سے نکل گئیں تو جوانی کی تتلیاں اسکے اندر پھر سے اڑنے لگیں اور بھاگتے بھاگتے وہ بھی اڑنے لگی۔ اس پر شوہر بوکھلا گیا۔ اب اس عورت کو قابو میں رکھنے کے لئے نہ بچوں کی دھمکی باقی بچی تھی اور نہ ہی وہ سعودی عرب میں تھا،

"ناحق بھاگنے کا مشورہ دیا۔"

اب تہمینہ جو سیمنار اٹینڈ کرتی تھی اس میں عورت اپنی ذات کی خوشی کے علاوہ کسی اور

کو خوشی دینے کی پابند نہیں تھی۔ ہاں اگر وہ خود کو خوش کر سکے تو اس روانی میں راستے میں آنے والے رشتوں کو بھی اس سے خوشی مل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر عورت خود ہی خوش نہیں تو کسی کو کیا خوشی دے گی بس اس کے لئے اپنی خوشی سب سے زیادہ مقدم ہونی چاہیئے۔ یہ سیکھ کر تہمینہ کو اب مذہب اور ثقافت کی زبان میں قربانی، ایثار اور رواداری سمجھانا ناممکن تھا۔ نرم پھول، پتھرا چکا تھا اور ایسا شوہر صاحب نے اپنے ہاتھوں سے کیا تھا۔

اور ایکدن اس کی ایسی ہی آزادانہ حرکتیں دیکھ کر جب اس کی مشرقی غیرت جاگی تو اس نے بیوی پر ہاتھ اٹھا دیا، مگر وہ پہلے جیسی تہمینہ نہیں تھی جو خاموشی سے تھپڑ کو پی جاتی، اس نے ایک منٹ ضائع کئے بغیر 911 کو کال کر دیا تھا اور بس وہ ان کے اس ٹوٹے پھوٹے رشتے کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا تھا۔

اب وہ اکیلی رہتی تھی۔ اس اپارٹمنٹ میں جب وہ اکیلی منتقل ہوئی تھی تو شروع شروع میں سالوں کی گھٹن کو خوب مزے لے لے کر زندگی سے نکالا تھا اور آزادی کے ایک ایک لمحے کو شہد کی طرح روح میں اتارا تھا۔ طلاق کے بعد ملنے والے ماہانہ پیسے اتنے نہیں تھے کہ اس کے بڑھے ہوئے عیاشانہ اخراجات پورے ہو سکیں اپنے شوہر کو دکھانے کے لئے (کہ اسکے بغیر بھی اچھی زندگی گذر سکتی ہے) اس نے مہنگا اپارٹمنٹ، مہنگی گاڑی اور مہنگا فرنیچر lease پر لے لیا تھا۔ اور ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ایک ہمدرد نے اسے جو راستہ دکھایا تھا وہ راستہ بظاہر آسان مگر اس کی منزل کانٹوں بھری تھی، پیسوں کے حصول کا سہل اور شارٹ کٹ طریقہ۔۔۔۔ پاکستان میں ہوتی تو کسبی، فاحشہ یا ویشیا کہلاتی مگر یہاں کینیڈا میں "خودمختار" کہلائی جانے لگی۔

اب وہ کالی برف کی طرح پوشیدہ اور خطرناک صورت اختیار کئے، اپنی کمیونٹی سے دور دور پتھرائی بیٹھی رہتی تھی۔

اسے پاکستانیوں کی بال کی کھال اتارنے اور دوسروں کی زندگیوں میں مداخلت کرنے کی عادت بڑی زہر لگتی تھی ۔ کہاں وہ اپنے لوگوں کے لئے ترستی تھی اور اب کہاں وہ انہیں دیکھ کر نظریں چرا لیتی تھی جیسے وہ ان سب کی مجرم ہو ۔ اسے وقت سے بھی بڑا گلا رہتا تھا کہ جب اسکی جوانی شیرے کی طرح ٹپکتی تھی تب وہ پابندِ سلاسل تھی، آج بیڑیاں کھول دی گئیں تو جوانی کا شیرہ سوکھ چکا تھا ۔ اب کچوری گالوں سے شیرے کا رس نہیں بلکہ سوکھی مرونڈیاں نکلتی تھیں ۔ پٹھان عورتوں کی جوانی تو ویسے بھی چار دن کی چاندنی ہوتی ہے ۔ گو کہ کینیڈا میں بھی سدا جوان رہنا مشکل ہوسکتا ہے مگر جوان نظر آنا قطعاً مشکل نہیں تھا ۔ اسلئے وہ اپنے آپ کو سمجھاتی کیا ہوا وہ جوان نہیں رہی تھی مگر جوان نظر تو آسکتی تھی ، یہ بھی اسی ملک کا کمال تھا ۔ اور وہ آسمان کی طرف چہرہ کر کے لمبی تازہ ہوا پھیپھڑوں میں بھرتی اور کہتی :

" آئی لو کینیڈا ۔ ۔ "

اب تو اس نے بال بھی ہلکے سنہری رنگوا لئے تھے، نہ سفید بالوں کا بانس رہے گا نہ ڈھلتی عمر کی بانسری بجے گی ۔ آنکھیں ایک ایسی چیز ہوتی ہیں جن کے نیچے عمر کی لکیریں میک اپ میں کامیابی سے چھپالی جائیں تو ان کی خوبصورتی جوانی والی نظر آسکتی ہے ۔ اسکی بڑی بڑی آنکھیں جن پر اس نے اب مصنوعی لمبی پلکیں جمالی تھیں اور فاؤنڈیشن کی گہری تہوں میں ٹھوڑی کا بدلتا رنگ بھی چھپ جاتا تھا اور ماتھے کی جھریاں بھی ۔ پیسہ ہونا چاہئے ، جلد کو لٹکنے سے بچانے کے اب ایک سو ایک طریقے آ چکے تھے اور اسے بڑی امید تھی کہ وہ جسم کے کسی حصے کو ڈھلکنے نہیں دے گی ۔ اس کوشش میں وہ پیسہ پیسہ بچا کے رکھتی جیسے بنک کے سیونگ اکاؤنٹ میں پیسہ نہیں عمر کو قید کر رہی ہو ۔ اس پیسے کی وجہ سے ہی تو وہ ڈھلتی عمر کو ہاتھوں میں تھامے ہوئی تھی ۔ بچوں اور خاوند کے جانے کے بعد اسکے دل میں " چلے جانے " کا خوف ٹھہر سا گیا تھا ۔ اس لئے وہ پیسے اور عمر کو جانے نہیں دینا چاہتی تھی ۔ یہ کوشش بڑی

غیر فطری اور غیر معمولی تھی ، اور اس سے اُس کے بدن میں تھکاوٹ اترتی جا رہی تھی اور وہ شکست خوردہ اور مضمحل لگتی تھی ۔

کبھی کبھی وہ تھک کے سوچتی کہ اس کی زندگی کیسی بیابان اور بنجر زمین ہوگئی ہے ، لوگ آتے جاتے ہیں مگر کوئی رکتا نہیں ۔ سب پل دو پل کے ، اپنی اپنی غرض کے ساتھی ، آتے تو اپنے سارے غم اسے تھما دیتے تھے ، جاتے تو پلٹ کر دیکھتے بھی نہ تھے ، مگر کوئی ایسا ساتھی نہیں تھا جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ بھی دو گھڑیاں رو سکے ۔ وہ صرف سفید ، نرم پھول جیسی لوگوں کی نگاہوں کے آگے اڑتی پھرتی ، کھلکھلاتی ، یہی تو اب اس کی روزی روٹی تھی ۔ ڈھکی چھپی کالی سخت برف جیسی زندگی کو یاد کرتے ہوئے وہ کچھ دیر کے لئے یہ فراموش ہی کر بیٹھی کہ وہ کون ہے اور اس وقت کہاں کھڑی ہے یہاں تک کہ خاموش آنسو اس کی گالوں سے تیرتے ہوئے اس کی گردن تک آ پہنچے تو ان کی سرسراہٹ سے وہ ایک دم جیسے نیند سے بیدار ہوگئی اور کیا دیکھتی ہے کہ ایک آدمی کالی برف سے پھسل کر گر گیا ہے ، ایک دفعہ گرتا تو کوئی بات بھی نہیں تھی مگر وہ کھڑا ہوتا اور پھر گر جاتا بار بار گرنے کا انداز ایسا تھا کہ تہمینہ کی بے اختیار با آواز ہنسی نکل گئی ۔ مگر جب وہ کافی دیر تک نہیں اٹھا تو اسے تشویش ہوئی کہ کہیں زیادہ چوٹ نہ لگ گئی ہو ۔ ۔ وہ ہنسی روک کے پریشانی بھرے انداز سے ستھری انگریزی میں چلائی :

" سنیئے آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں لگی ۔ ۔ کسی مدد کی ضرورت ہے ؟ "

آدمی نے وہیں لیٹے لیٹے ، سر اٹھا کر اس بالکنی کی طرف دیکھا جہاں سے پہلے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ اور پھر یہ سوال برآمد ہوا تھا ، وہاں ایک ادھیڑ عمر دلکش عورت کھڑی تھی ، جس کا جسم کوٹ میں اور سر سکارف میں لپٹا ہوا تھا اس کے باوجود اس کی تیز نظریں پہچان گئیں کہ وہ کوئی دیسی ہی تھی سو اس نے بھی اپنی آنکھوں کو شرارت اور شکائت سے بھرتے ہوئے کہا :

"آپ تو ہنس رہی تھیں، محترمہ! کسی گرے ہوئے پر ہنستے نہیں"۔ وہ اردو میں ہی بولا تھا کیونکہ جانتا تھا سنہرے بال اور میک اپ کے گورے غلاف کے نیچے اپنی ہی مٹھائی ہے۔

"اچھا میں نے تو سنا تھا گرے ہوئے پر ہنس لیتے ہیں گرے پڑے پر نہیں۔۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔۔تہمینہ کا تہہ کیا ہوا پیٹ ہنسی کے دورے میں پھر سے اس کے کالے کوٹ سے باہر چھلکنے لگا۔

آدمی جو بار بار پھسلنے کے بعد اب کالی برف سے اپنے پاؤں ہٹانے اور جم کر کھڑا ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا، نے چونک کر اس خاتون کو دیکھا اور سوچا،

"بڑی ٹائٹ پٹاخہ ہے"۔

آدمی جو یقیناً اس سے عمر میں کئی سال چھوٹا تھا اب بڑی گہری نظروں سے تہمینہ کا جائزہ لے رہا تھا۔تہمینہ کا فلیٹ تیسری منزل پر تھا، اس لئے اسے آدمی کے نقوش صاف نظر آرہے تھے۔ویسے بھی قریب کی نظر عمر کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھی، دور کی تو اسکی ہمیشہ سے ہی تیز رہی تھی۔آدمی کا صاف کھلتا ہوا رنگ، ستواں ناک اور اس کے نیچے کھنچے لمبے پتلے ہونٹ اسے صاف نظر آرہے تھے۔

ابھی وہ اسکی آنکھوں کو غور سے دیکھ ہی رہی تھی کہ آدمی وہیں سے چلایا،

"اب میری بے بسی پر ہنسی ہیں تو اس مفت کی تفریح کے دام بھی چکائیے۔۔"

"کیا مطلب۔۔؟ اس نے مصنوعی حیرت سے اپنی آنکھوں کو اور بھی پھیلا دیا۔۔

یہ طریقے وہ تب استعمال کرتی جب وہ کسی بھی نئے شکار کے ساتھ ہوتی تھی۔۔کبھی مصنوعی حیرت اور معصومیت سے آنکھوں کو نشیلا سا کر کے پھیلا دینا، کبھی کھلکھلا کر ہنس دینا (کیونکہ اس نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ ہنستے ہوئے انسان اپنی عمر سے بہت چھوٹا نظر آتا ہے) پھر کبھی کبھار گاہک کے مزاج کے مطابق مصنوعی اداسی کا خول، اور شوہر کی من گھڑت

بے وفائی کے قصے، لیکن زیادہ تر تو وہ دوسروں کی ہی رام لیلائیں سنتی تھی، یہ سب مل ملا کر اس کے پیشہ ور ہتھیار تھے۔۔مگر ابھی یہاں اس نے ترکش کا پہلا ہی تیر نکالا تو محسوس ہوا کہ مقابل اتنا اناڑی ہے کہ فوراً ہی چاروں شانے چت ہو گیا ہے۔

"مجھے اتنی سردی میں کچھ چائے یا کافی پلائیں۔" اجنبی نے اسے اپنی گہری آنکھوں میں غوطہ لگواتے ہوئے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

"میں اجنبیوں پر بھروسہ نہیں کر سکتی، اکیلی رہتی ہوں کوئی رسک نہیں۔

کہنے کو تو اس نے کہہ دیا مگر اندر سے تہمینہ کا دل کر رہا تھا کہ ایک منٹ سے بھی پہلے اس شکار کو اوپر بلا لے، کیونکہ آج اس کا دن بالکل خالی تھا، نہ کسی نے اپارٹمنٹ میں آنا تھا نہ اس نے کہیں کسی کے ساتھ جانا تھا۔اور اب تو بہت سارے دن ایسے ہی بے کاری میں گزر جاتے تھے۔اس کے "ہمدرد" کی تو کوشش ہوتی تھی کہ اس کے ساتوں دن مصروف گذریں مگر اب لاکھ کوششوں کے باوجود ڈھلتی عمر کے ساتھ کاروبار میں بھی فرق پڑ رہا تھا۔اور گاہکوں کو کاروباری انداز سے پھنسانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔پھر مسٹر ہمدرد کی کمیشن، اس طرح تہمینہ کے ہاتھ بہت کم پیسے آتے تھے۔اس لئے زیادہ تر وہ "ہمدرد" کی بجائے اپنے ایسے ہی گھریلو طریقوں والے گر آزمانے لگ گئی تھی۔سوشل میڈیا پر بھی اب اسے خود ہی کافی ہاتھ پاؤں چلانے پڑتے تھے مگر ایسے ملنے والے اکثر کھوکھلے، منہ زبانی کی عیاشی والے ایسے قناعت پسند عاشق نکلتے تھے، جن کی تسلی اب غیر عورتوں سے روکھے" ہوائی رابطوں" میں ہی ہو جاتی تھی اور باتیں بھی وہ جن میں ہاتھ تک تھامنے یا آنکھوں میں دیکھنے کی بھی نوبت نہ آئے۔۔بس دیوار پر لٹکے بے نام سے، کھوکھلے، سرد جالے کی طرح جنہیں بس بُنتے جاؤ اور بے کار میں الجھتے جاؤ اور اسی الجھن میں ان کی ساری مردانگی نکل جاتی تھی۔۔ تہمینہ کو ایسے مرد زہر لگتے تھے جو صرف ڈھول کی طرح اپنے آپ کو ہی بجاتے رہتے تھے، نامرد کہیں کے۔۔اس کا بس چلتا تو ایسے آدمیوں کو دنیا سے غائب کروا دیتی کیونکہ ایسے

زخموں کی وجہ سے اس کا قیمتی وقت برباد ہوتا تھا۔

"ارے سوچوں سے نکلیں ۔۔سوچیں ہی سوچیں تو نو موجیں ۔" ۔ وہ شرارت سے بازار کے لونڈوں کی طرح بولا۔۔

"ہائے ۔۔۔۔کتنے عرصے بعد اپنی زبان میں ٹھرک کی کوئی بات سنی تھی ۔ وہ بھی جوان مرد سے اور جو اس سے چائے مانگ رہا تھا اور جس کی آنکھیں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں :

"مجھے سردی لگ رہی ہے مجھے گرم کر دیں"

دماغ نے کہا اس کی آنکھوں کو دھیان سے پڑھو ان میں گرمی کے بدلے " کوئی بھی معاوضہ " دینے کا عندیہ بھی ہے یا نہیں ؟۔۔

دماغ نے سمجھایا معاوضہ دینے کو تیار تو ہے مگر اپنی ہی کمیونٹی کا ہے ، بدنامی نہ ہو جائے ، اسے اپنے لوگوں میں نیک نامی کی بڑی پرواتھی ۔اس بلڈنگ میں کچھ ہی پاکستانی فیملیز تھیں مگر جو بھی تھیں ان کے زیادہ تر شوہر مڈل ایسٹ میں تھے اور وہ یہاں بچاریاں اپنے بچوں کو تنہا پال رہی تھیں ۔ گو پیسے کی کوئی کمی نہ تھی مگر ایسے ملکوں میں بچے اکیلے پالنا کون سا آسان کام ہوتا ہے ۔اس لئے تہمینہ ان عورتوں سے بھی دور ہی رہتی تھی ۔شوہروں کے بغیر عورتیں تو اور بھی دوسرے لوگوں پر نظر رکھتی ہیں ، شوہر ساتھ ہوں تو ان کی جاسوسی میں لگی رہتی ہیں اور کسی اور طرف دھیان کم ہی دیتی ہیں ، اس لئے تہمینہ ان سے دور ہی رہتی تھی ۔

"اس پاکستانی آدمی کو اپنے اپارٹمنٹ میں پیسوں کی خاطر بلانا ٹھیک ہوگا یا نہیں ۔۔۔نہیں بلاتی ۔۔اس نے خود سے کہا۔۔"

اور وہ کہہ رہا تھا،" محترمہ میں آپ کو کھا نہیں جاؤں گا اور ذو معنی ہنسی ہنستے بولا اللہ قسم صرف چائے پیئوں گا، اور کچھ نہیں کھاؤں گا".

اس نے اپنی تنہائی کی بات جان بوجھ کر اس اجنبی سے کی تھی ، تا کہ وہ کچھ بھی کہنے

میں خود کو آزاد محسوس کرے ۔۔اور نتیجہ بالکل اس کی امنگوں کے مطابق آ رہا تھا۔۔

وہ اب بڑی گھاگ ہو چکی تھی ، میک اپ نے صرف اس کی جھریوں کو ہی نہیں اس کے تاثرات کو بھی اپنے اندر چھپا لیا تھا۔ جو وہ دکھانا چاہتی بس وہی آدمی دیکھ پاتے مگر یہ آدمی تو اس کی میک اپ کی تہوں میں گھسا ہی چلا آ رہا تھا۔۔۔

" پھر کبھی سہی ۔۔۔" یہ کہہ کر وہ ایک شانِ بے نیازی سے بالکنی سے اندر چلی گئی ۔۔

وہ تھوڑی دیر وہاں بالکنی کا دروازہ کھلنے کا انتظار کرتا رہا اور جب وہ نہیں کھلا تو بلڈنگ کے صدر دروازے سے داخل ہو کر فلور ون کے اپارٹمنٹ 101 کا بزر دبانے لگا۔۔۔ دوسرے ہی لمحے گھرر کی آواز آئی اور وہ بلڈنگ کے اندر داخل ہو گیا۔آج بہت دنوں بعد وہ یہاں آیا تھا۔

"شارق !بہت دنوں بعد آئے ہو"۔

اس کے اندر داخل ہوتے ہی ایک جوان سالہ عورت نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا

۔۔

'ہاں بس کام کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہتا ہوں ، جب سے نوکری گئی ہے میں تو قلاش ہو گیا ہوں ، کیا کروں تمھاری طرح کسی امیر ارب پتی کی بیوی نہیں ہوں نا"۔اس نے سجی سنوری عورت کو اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا۔

" شکر کرو کسی ارب پتی بڈھے کی بیوی نہیں ہو ورنہ میری ہی طرح اکیلے ہوتے ، اور لوگوں کا وقت اور محبت خریدتے ۔" عورت نے اداس نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا،

"ارے میری جان اکیلی کہاں ہو؟ ہم ہیں نہ تمھارے غلام ،تمھاری آنکھ کے ایک اشارے پر تمھارے قدموں میں اپنی جان لٹا دیں ۔تم بس مجھ پر اعتبار کرو اور اپنے سارے غم میری جھولی میں ڈال دو اور بس بے فکر ہو کہ زندگی کے مزے لو۔"

شارق نے عورت کے نیل پالش سے رنگے خوبصورت نازک ہاتھوں کو آنکھوں

سے لگاتے ہوئے کہا۔

"تمھاری انہی باتوں سے تو میں زندہ ہوں، شکر ہے تم میرے ساتھ ہو۔ اور مجھ سے اتنا پیار کرتے ہو۔ اسی لئے تو سب کچھ تم پر لٹا دیا ہے ورنہ میرا شوہر تو مجھے اِدھر بچوں کی آیا بنا کر بھول چکا ہے"

"جانِ من! وہ مڈل ایسٹ میں عیش کر رہا ہو گا، تم یہاں اس کی یاد میں کڑھ کڑھ کر اپنا اور میرا وقت برباد کرتی رہو گی... تُو پیار ہے کسی اور کا تجھے چاہتا کوئی اور ہے۔۔۔۔ تو پسند ہے کسی اور کی، تجھے مانگتا کوئی اور ہے۔۔"

اب شارق لہک لہک کر گانے لگ گیا۔ سکول کالج کے زمانے سے ہی لڑکیاں اس کی آواز پر مرتی تھیں اور اس گانے کی وجہ سے اس کے فلرٹ کے بہت سے مرحلے آسان ہو جایا کرتے تھے۔ آج بھی کسی مشکل تالے سے پالا پڑ جاتا تو اسے کھولنے کے لئے یہی گانے کی چابی کام آتی تھی۔

اور اب بھی کتنی سہولت سے اس کا کام ہو گیا۔۔۔۔

دو تین گھنٹے بعد جب وہ اس اداس اور تنہا حسینہ کی پیاس بجھا کر واپس جا رہا تھا تو لاشعوری طور پر اس کی نظریں اُسی بالکنی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ ادھیڑ عمر عورت وہیں کھڑی تھی مگر اب وہ دوسری طرف والی ریلنگ پر جھکی ہوئی تھی۔

اسے یکا یک احساس ہو گیا کہ یہ عورت بھی بہت تنہا ہے اور اس کا دل کیا وہ اس عورت کی بھی تنہائی بانٹ لے۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ ایسی تمام عورتوں کی تنہائی بانٹ لیتا۔ اس کا نازک دل کسی کو بھی تکلیف میں دیکھ کر بے چین ہو اٹھتا تھا۔۔

اس نے 101 والی فرخ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس ہفتے روز آیا کرے گا۔ نوکری نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پاس فراغت تھی اور پارٹ ٹائم بچوں کو کرکٹ کلب میں ٹریننگ دینے والا کام بھی بس ایسے ہی تھا کہ کبھی اسے بلا لیا جاتا اور کبھی نہیں۔ کینیڈا میں کرکٹ سیکھنے

والے بچوں کی تعداد ابھی اتنی نہیں تھی کہ کلب زیادہ ٹرینرز رکھے بس اسے ہی گھسیٹ رہے تھے۔۔ ایسی بے روزگاری میں اس کا دل مزید لوگوں کے دکھوں پر نازک ہو جاتا تھا۔ ایسی قدرت کی طرف سے فراہم کی گئی فراغت میں اگر وہ فرح جیسی تنہا عورتوں کی تنہائی بانٹ لے تو اس سے اچھا وقت کا مصرف کیا ہو گا۔

اگلے دن بلڈنگ کے صدر دروازے پر جانے اور 101 کا بزر دبانے سے پہلے شارق پھر اس بالکنی کے سامنے رک گیا اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگ گیا۔ آج برف باری نہیں ہو رہی تھی۔ اور درجہ حرارت بہت گر چکا تھا۔ کل اس کے بالوں کو برف کے سفید پھول چوم رہے تھے، آج وہاں بغیر مفلر یا ٹوپی کے اس کے بال ٹھنڈی چبھنے والی سوئیوں کی طرح ہو رہے تھے۔۔ اس نے مایوسی سے ٹھنڈی آہ بھری اور جانے ہی لگا تھا کہ سخت سردی میں یکا یک بہار آ گئی اور اس بالکنی کا دروازہ ایسے کھل گیا جیسے اس نے آہ نہیں بھری تھی بلکہ کھل جا سم سم کہا تھا۔

اب وہی عورت کالی چادر میں لپٹی اس کے سامنے کسی افسانے کا کردار لگ رہی تھی، اسے دیکھ کر شارق کو احساس ہو رہا تھا جیسے اُس عورت کی آنکھیں ساری رات اُسی کے انتظار میں جلتی رہی ہیں اور سرخ لپ سٹک کے باوجود اُس کے ہونٹوں کا جامنی پن ہر طرف پھیل رہا تھا۔ اس کی چھوٹی سی ناک کی چونچ باہر نکلتے ہی سرخ ہو گئی تھی، اس عورت نے شارق کو ایسی معصومیت اور حیرت سے دیکھا جیسے اٹھارہ سال کی لڑکی کو گلی میں جاتے ہوئے محبوب اچانک روک لے اور جیسے ہی شارق کو اس عورت کے قدم رُکے ہوئے محسوس ہوئے اس نے اپنے قدموں کی رفتار بڑھا دی کہ گاڑی سٹیشن سے نہ چھوٹ جائے اور فوراً بولا:

"دیکھئے اسے آپ کیا کہیں گی؟ دل کو دل سے راہ۔۔ یا۔۔۔۔"

"تنہائی سے فرار میں اسے تنہائی سے فرار کہوں گی۔۔" تہمینہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں دنیا بھر کی اداسی بھرتے ہوئے کہا۔

"میرے ہوتے ہوئے؟ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر یوں اپنائیت سے پوچھا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔

پھر عورت کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے انتہائی محبت سے بولا،

"لایئے اپنا اکیلا پن میرے حوالے کر دیں۔۔"

"ارے ارے اتنی سردی میں آپ نے نہ دستانے پہن رکھے ہیں اور نہ ہی مفلر اوڑھ رکھا ہے کیسے بے پرواہ انسان ہیں آپ۔ بیمار پڑ جائیں گے۔۔"

وہ مصنوعی پریشانی سے بولی حقیقت میں اب اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کوئی جیئے یا مرے، اس مہینے نہ گھر، نہ گاڑی کسی چیز کی قسط نہیں گئی تھی۔ اس کا سابقہ شوہر مستقل طور پر کینیڈا چھوڑ کے دفعان ہو چکا تھا اور یہاں کے قانون کے مطابق طلاق کے بعد اسے جو بھی دیتا تھا، اب اس سے بھی مفرور ہو گیا تھا۔۔" بھگوڑا کہیں کا۔۔"

"خدا گواہ ہے آج تک کبھی کسی نے میری ایسے فکر نہیں کی، آپ کا خلوص دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں"۔

شارق نے زبردستی آنکھوں کو نمناک کرنے کی کوشش کی۔۔۔

" آپ اوپر آ جائیں اپارٹمنٹ نمبر 301۔۔"۔

تہمینہ نے یوں ظاہر کیا جیسے اس آدمی کی اسی بات سے متاثر ہو کر اسے اوپر بلا رہی ہے۔۔ ابھی بھی وہ اس آدمی کے پاکستانی ہونے کی وجہ سے تھوڑی گھبراہٹ کا شکار تھی مگر یہ رسک تو اب لینا ہی پڑنا تھا، ورنہ تو وہ سڑک پر آ جاتی۔ یہ آدمی اسے دیکھنے میں کھاتا پیتا اور معصوم لگ رہا تھا۔ زیادہ عمر نہ ہونے کی وجہ سے اتنا گھاگ نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے مستقل ہی انتظام ہو جائے، ہر مہینے گاڑی کی ہی کم از کم قسط دے دے۔۔۔ اس نے کئی فلموں میں دیکھ رکھا تھا، جوان لڑکے اپنے سے بڑی عمر کی عورتوں کے عشق میں ایسے مبتلا ہوتے ہیں کہ اپنا سب کچھ ان پر نثار کر دیتے ہیں۔۔" کاش یہ بھی کوئی امیر زادہ ہو اور مجھ پر اپنا سب کچھ

لٹانا شروع کر دے۔۔"

شارق کے اوپر آتے آتے تہمینہ نے شیخ چلی کے بہت سے انڈے تیار کر لئے تھے مگر اس کو سامنے پا کر نجانے کیوں وہ گھبرا سی گئی۔۔

جب سے اس نے یہ کام شروع کیا تھا تو زیادہ تر دوسری کمیونٹی کے مردوں سے ہی پالا پڑا تھا، جہاں بات کم اور بس کام ہوتا تھا۔ اگر کوئی دیسی مرد ہوتے بھی تو بوڑھے سے، جو زیادہ تر بس شرمندہ ہو کر ہی چلے جاتے تھے۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ اپنے ملک اور اپنی زبان کا آدمی، وہ بھی جوان اور خوبصورت اور جو اس پر بے تحاشا محبت لٹانے کے لئے تیار بیٹھا تھا
۔

" آؤ بیٹھو۔۔" تہمینہ نے سنبھلتے ہوئے کہا اور پہلے خود صوفے پر بیٹھ گئی، تو وہ بالکل اس کے ساتھ ہی جڑ کر بیٹھ گیا، تہمینہ کی ہتھیلیوں اور ماتھے سے ٹھنڈے پسینہ پھوٹ نکلا، شارق نے بڑے اعتماد سے انگلی عورت کی پیشانی پر آئے قطروں پر پھیری۔۔

" ارے آپ تو بالکل چھوٹی سی بچی لگ رہی ہیں۔"

اس پر تہمینہ نے خود کو بھی بچی بچی محسوس کیا۔ اس کا دل کیا وہ شارق سے کہے کہ اس بچی کو وہ بس اپنے سینے میں چھپا لے اور اسے کچھ نہیں چاہیے۔

" آپ کی آنکھوں میں کتنی اداسی ہے۔ آپ ہنستی ہیں تو بھی دکھ چھپا نہیں پاتیں۔۔ لایئے اپنے سارے دکھ مجھے دے دیں۔۔۔"

اور تہمینہ اس کی باہوں میں برف کے پھولوں کی طرح پگھلنے لگی۔۔

" آپ کے شوہر آپ جیسی حسین بیوی کو چھوڑ کر مڈل ایسٹ میں پیسہ بنا رہے ہونگے اور آپ یہاں تنہا بچوں کی آیا گیری میں عمر کاٹ دیں گی۔۔۔؟ شارق نے اپنے پرانے تجربے بروئے کار لاتے ہوئے کہا۔

تہمینہ کے لبوں پر الفاظ آ آ کر دم توڑنے لگے اور وہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی

اور اسے خود بھی خبر نہیں تھی کہ یہ آنسو سچے ہیں یا کاروباری؟

"روئیں نہیں، آپ کے آنسو اتنے بے وقعت نہیں ہیں، آپ مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں، میں کبھی بھی آپ کے اعتماد کو دھوکہ نہیں دوں گا۔ میں خود اپنے ہی لوگوں کا ڈسا ہوا ہوں، اپنی کمیونٹی کسی کو نہیں چھوڑتی، بس آپ اپنے راز میرے حوالے کر دیں اور بھول جائیں۔۔ میں کبھی بھی آپ کا اعتماد نہیں توڑوں گا۔"

برسوں کی تنہائی تہمینہ کے مساموں سے پھوٹنے لگی اور اس کا سارا جسم ایسے پسینے میں بھیگ گیا جیسے وہ ابھی ابھی نہا کے نکلی ہو۔

وہ دھیمے لہجے میں پیار سے بولتا جا رہا تھا۔

"میں بھی بہت تنہا ہوں۔ آج تک کوئی تنہائی کا ساتھی نہیں ملا مگر آپ سے مل کر لگ رہا ہے کہ اب سب غم دور ہو جائیں گے۔۔"

وہ دونوں کافی دیر تک یونہی دنیا و مافیا سے بے خبر ایک دوسرے کی تنہائی اور غم بانٹتے رہے۔ جب سارا غم بہہ گیا تو وہ اچانک سے بولی:

"میں طلاق یافتہ ہوں۔۔ میرے شوہر مڈل ایسٹ میں بیٹھ کر مجھے پیسے نہیں بھیج رہے بلکہ میں تو۔۔۔

تہمینہ نے زندگی میں پہلی بار کسی گاہک سے اپنی ذاتی زندگی کی بات کی تھی کیونکہ اب ایسے ہی اسے اپنے مدعے پر آنا تھا، اس کو زندگی کے راز میں شریک کر کے، زندگی بھر کا سہارا جو بنانا تھا۔

"ارے واہ پھر تو آپ اور بھی تنہا ہونگی اور کاش میں بھی کسی امیر آدمی کی مطلقہ ہوتا، کینیڈا میں امیر آدمی سے طلاق لینے کا مطلب آزادی کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی۔۔۔ ہے نا؟ آپ کے تو مزے۔۔۔"

اب پتلون چڑھاتے اسے ساتھ ساتھ 101 میں بیٹھی فرح کا خیال آ رہا تھا۔ مگر

دل کو تسلی تھی کہ ایک تنہا عورت کے پاس جانے سے پہلے ایک اور تنہا عورت کی تنہائی دور کر دی تھی، نیکی کے اس خیال نے اسے اعتماد اور اس کے دل کو سکون مہیا کیا۔

تہمینہ نے اسے کپڑے پہنتے دیکھا تو کہا:

"اتنی بھی کیا جلدی ہے، ابھی کچھ دیر اور یونہی میرے ساتھ لیٹے رہو اس گھر کی تنہائی مجھے کاٹ کھاتی ہے"۔

"کس کافر کا تمھارے پاس سے اٹھنے کو دل کر رہا ہے مگر مجھے ایک ضروری کام سے کہیں اور بھی جانا ہے۔۔ مگر میری جان فکر نہ کر اب تو تمھارے پاس آنا جانا لگا ہی رہے گا، اب تو یہ دروازہ ہم نہیں چھوڑنے والے۔۔ مستقل عاشق ہو گئے ہیں۔۔"

شارق نے اپنے سے بڑی عمر کی ایسی کھنڈر اور بے ہنگم عورت کے ساتھ ابھی ابھی گزارے لمحات کو دل سے نکالنے کی کوشش میں کچھ زیادہ ہی الفاظ کا بے دریغ استعمال کر دیا اور سوچنے لگا آپ سے تم اور تم سے تُو ہونے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔

اور تہمینہ کا دل تو اس کی باتیں سن کر خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے زیرِ لب اللہ کا شکر ادا کیا کہ خرچے کا کچھ تو مستقل انتظام ہوا ہے اور اپنے ہاتھوں پر ابھرنے والی جھریوں کو تکئے کے نیچے چھپاتے ہوئے بولی،

"تم نے تو مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی دے دی اب میں تمھیں اپنی زندگی کے سارے راز بتاؤں گی۔ تمھارے علاوہ میں نے اور کس پر اعتماد کرنا ہے؟ اس کی آنکھیں سچ مچ فرطِ جذبات سے بھیگ گئیں۔۔۔

"میں عام طور پر پانچ سو ڈالر لیتا ہوں مگر آپ دیکھ لیں جو بھی آپ مناسب سمجھیں مگر یہ یاد رکھئے گا کہ آج کل میری نوکری نہیں ہے اور یہاں کے اخراجات اور چھوٹے چھوٹے دو بچوں کو پالنا، میری بیوی بھی کوئی جاب نہیں کرتی بیمار رہتی ہے بس بچے ہی سنبھال لے تو بہت ہے۔

شارق نے ایکدم 440 وولٹ کا جھٹکا دے دیا۔۔وہ حواس باختہ سی اسے دیکھ رہی تھی اور وہ کہے جا رہا تھا؛

"تم نے ابھی اتنا پیار دیا اور مجھ پر اعتماد کیا تم یقین مانو میں آج سے تمھارے دروازے کا کتا بن کر تمھاری اور تمھارے رازوں کی حفاظت کروں گا۔، خوشیوں سے تمھاری جھولی بھر دوں گا۔۔لاؤ اپنے سارے دکھ مجھے دے دو۔۔کیش دوگی یا چیک؟

تہمینہ، سفید لٹھے جیسی، یا برف جیسی رنگت لئے بے حس وحرکت اسے دیکھے جا رہی تھی۔

اور وہ سوچ رہا تھا اب جلدی سے اسی بلڈنگ میں 101 کو نبٹا کر اس عورت کے پاس بھی آج ہی پہنچ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں جس نے کل ہی فیس بک پر چیٹنگ کے دوران اسے بتایا تھا کہ اس کا شوہر اسے گھر میں بٹھا کر بھول گیا ہے اور وہ سارا سارا دن یا بچوں کو دیکھتی ہے اور یا پاکستان کی یادوں میں گم رہتی ہے، جہاں اس کی زندگی تھی، رشتے دار تھے اور دوست تھے اور یہاں اس کا دکھ بانٹنے والا کوئی نہیں اور وہ گھر میں بے کار سامان کی طرح پڑی ہوئی ہے۔۔ایک اور بے کار سامان کو مفید بنانے کے لئے آج ہی اس کے پاس بھی چلے جانا چاہئے۔شارق نے سوچا،

"میرے بس میں ہو تو ایک دن میں کم از کم سو عورتوں کی تنہائی دور کر دوں۔۔"

"یہ سالا تو فاحش، مرد کسبی، طوائفا، رنڈا۔۔۔کیا مصیبت ہے اس نے جھلا کر سوچا ایسا پیشہ کرنے والی عورتوں کے تو اتنے نام ہیں اور ایسے مردوں کے لئے اردو زبان میں ایک بھی نام نہیں۔۔۔ایسی غریب زبان۔

کلیسا میرے آگے

ریحانہ نے چائے کے ساتھ پکوڑے بھی اس کے آگے رکھے تو وہ چونک گیا۔ایسی خدمت گزاری وہ اُسی وقت کرتی تھی جب اس کے دل میں کوئی بڑا طوفان چھپا ہوتا تھا۔ گھبراہٹ میں احمد کا ہاتھ ہلکا سا کانپا اور چائے کپ سے باہر چھلک گئی۔ نارمل حالات ہوتے تو ایسی لاپرواہی پر بیوی نے اس کے پرخچے اڑا دینے تھے۔مگر یہ دیکھ کر احمد کے خوف میں مزید اضافہ ہوا کہ اس حرکت پر بھی وہ صرف خاموشی سے گھور کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

عام طور پر جب، وہ تھکا ہارا، آفس سے مختلف محاذوں پر کھیلتا ہوا، گھر کی دہلیز تک پہنچتا ہی تھا تو ہمیشہ اس کا استقبال ایک احتجاجی اور شکایتی ہنگامے سے ہوتا تھا۔ریحانہ کی زندگی کا کوئی، کبھی نہ پورا ہونے والا خواب، دن کا اور دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ بن کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔مگر آج گھر میں سناٹا اور پراسراری خاموشی تھی۔وہ ہمیشہ سکون کی دعا کرتا تھا، آج سکون تو تھا مگر اسکا دل کیوں دہلا جا رہا تھا۔۔

"اللہ کرم کرے اس سکون میں کون سا طوفان چھپا کھڑا ہے؟ میں بھی ہر چیز کو منفی طریقے سے دیکھنے لگ گیا ہوں۔ ہوسکتا ہے آج کچھ ایسا واقعہ ہوا ہو کہ ریحانہ کو اللہ نے احساس دلا دیا ہو، اور اس نے عہد کر لیا ہو کہ وہ کبھی بھی نہیں لڑے گی۔۔" ہوسکتا ہے، ہوسکتا ہے، اللہ بڑا مہربان ہے، معجزے بھی تو دنیا میں ہی ہوتے ہیں۔۔"احمد نے چائے کا گھونٹ

بھرتے ہوئے چھت کو دیکھتے ہوئے کہا، جیسے اللہ وہیں پر بیٹھا ہوا ہے۔

لانڈری روم سے مشینوں کے کھلنے بند ہونے کی آوازیں آنے لگیں تو وہ پھر سے گھبرا گیا۔اس کے گھر آنے کے بعد ریحانہ گھر کا کوئی کام خاموشی سے نہیں کرتی تھی۔اسے دس دفعہ جتلاتی تھی کہ "دیکھو مجھے کیسا ماسی بنا کے رکھا ہوا ہے،کوئی کام والی رکھو تو پتہ چلے کہ میں تمھیں کتنی سستی پڑتی ہوں" وغیرہ وغیرہ۔۔مگر آج ایسا کوئی ڈائیلاگ بھی سننے میں نہیں آ رہا تھا۔۔

"بچے نظر نہیں آ رہے؟"۔"احمد نے وہیں کاؤچ پر بیٹھے بیٹھے چیخ کر پوچھا تاکہ گھر کی پراسرار خاموشی میں کچھ تو ارتعاش پیدا ہو۔

"آج قران شریف پڑھنے جاتے ہیں،ساتھ والی کرسٹینا کو بھی پتہ ہوگا"۔۔بیوی کی غصے سے بھری آواز نے اس کو توانائی دی اور اپنے آپ کو مزید نارمل محسوس کروانے کے لئے پہلے سے بھی تیز آواز میں بولا: جس کو بتاؤ گی اُسے ہی پتہ ہوگا نا۔۔"

مگر یہ کیا اُدھر پھر سے خاموشی چھا گئی۔۔

"ہیں؟" دل بے چین ہوا اٹھا۔۔" کچھ تو گڑبڑ ہے جن باتوں پر اچھا خاصا محاذ کھڑا ہو جایا کرتا تھا، آج ان باتوں پر جواب ہی نہیں آ رہے، دال میں کچھ تو کالا ہے۔۔کیا ہے؟ یہ تو تب سمجھ آئے جب ریحانہ منہ سے کچھ پھوٹے، وہ تو کوئی اجنبی عورت بنی ادھر سے اُدھر گھومے جا رہی ہے۔۔"

اور احمد کو زندگی میں پہلی دفعہ احساس ہوا گھر آتے ہی بیوی کا لڑنا کس قدر ضروری ہے۔

آج آفس کی بھی جسمانی سے زیادہ ذہنی تھکاوٹ نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ بیوی کے پراسرار رویے کے اوپر اب دن بھر کی دفتری زندگی حاوی ہونے لگی، اس نے

آنکھیں موندلیں اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا دی۔۔وہ کس کو بتائے کہ آج رامیش نے میرے اوپر کیا وار کیا ہے؟ دفتر کا یہ ساتھی اس کی زندگی کا عذاب بن گیا تھا۔

"کاش پورے ٹورنٹو میں کوئی ایسا دفتر ہو جہاں کوئی ذات کا ہندو بنیاء نہ بیٹھا ہو تو پھر دیکھو میں کیسے ترقی کرتا ہوں"۔ ہر سال اسے ترقی کی امید نظر آتی مگر عین وقت پر اس سے یا اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو جاتی تھی اور اسے شک تھا کہ اس سب کے پیچھے رامیش کا ہاتھ ہے اور آج آفس میں ہونے والے واقعے کے بعد تو اس کا شک یقین میں ہی بدل گیا تھا۔

"مالک! اس دفعہ تو نیو ایئر پارٹی میں آؤ گے نا؟ ہر بار کی طرح غائب نہ رہنا"۔ رامیش بھیڑ کے روپ میں بھیڑیا، اس کے میز کے قریب آ کر بڑی نمائشی فکر سے کہہ رہا تھا۔۔

"مفت کی شراب نہیں پینی تو خود ہی سوچ لو کے اس قسم کی پارٹیوں میں میرے لئے کیا کشش ہو سکتی ہے؟" احمد نے جان چھڑاتے ہوئے سیدھی بات منہ پر ماری تھی۔

"مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی، تمھیں شراب سے کیا چڑ ہے؟ ساجد بھی تو تمھارے ملک اور مذہب کا ہے، اس نے تو کبھی ایسی بات نہیں کی۔ تمھیں پتہ ہے وکٹر بار بار تمھارا پوچھ رہا تھا لگتا ہے اسے پہلے ہی شک ہے کہ تم پارٹی میں نہیں آؤ گے"۔۔ رامیش نے کسی چالاک عورت کی طرح دائیں بائیں دیکھتے ہوئے اس کے قریب منہ لا کر انکشاف کیا تھا۔۔

"اور تمھیں پتہ ہے ساجد، وکٹر کے بہت قریب ہو گیا ہے اور دیکھنا اس دفعہ اس کے پروموشن کے مواقع بہت روشن ہیں۔اور تم بس رام رام کرتے رہنا۔"

رام رام نہیں، اللہ اللہ احمد نے غصے کو مشکل سے قابو کرتے ہوئے کہا اور اس کے بدلتے رنگ کو دیکھ کر رامیش نے فوراً اپنی بھی کینچلی بدل لی۔۔" دوست ہوں تمھارا، اور بھلا چاہتا ہوں، غلط نہ سمجھنا مجھے۔۔ساجد جیسی لچک اور social skills پیدا کرلو۔۔"

"وہ تو تمھارے میں ساجد سے بھی زیادہ اچھی ہیں، تو تمھیں ہی نہ استاد کرلوں اپنا؟
" احمد کا یہ طنز اس کی زندگی کی بہت بڑی کڑوی حقیقت بن چکی تھی۔ اس کا المیہ یہ تھا کہ ساجد اور رامیش نے کام اس سے سیکھا تھا مگر اسی لچک مچک کی وجہ سے چھلانگیں مارتے ہوئے اس سے کہیں آگے نکل گئے تھے اور وہ اسی میز پر ایسے ہی سالوں سے بیٹھا ہوا تھا۔ اور پتہ نہیں کب تک ایسے ہی بیٹھے رہنا تھا۔

ابھی وہ رامیش سے ہی نبٹ رہا تھا کہ دوسری " بلا " ان کا باس وکٹر اُسی کی میز کی طرف آتا دکھائی دیا تھا۔۔ " یک نہ شد دو شد "۔۔

احمد نے دل میں ایک دفعہ تو ارادہ باندھا کہ وہاں سے چپ کر کے بھاگ جائے، مگر اس سے پہلے وہ اس ارادے کو عملی جامہ پہنا تا، وکٹر ان کے سر پر موجود تھا۔ اور رامیش صاف نظر آنے والی مبالغہ آمیزی اور منافقت سے وکٹر کی گلابی شرٹ کی تعریف میں مصروف تھا۔

وکٹر نے تعریف سے محظوظ ہوتے ہوئے احمد کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔" امید ہے تم دونوں نیو ائیر پارٹی میں آرہے ہو؟"

" کیوں نہیں؟ نہ آنے کی وجہ مالک کے پاس ہے، ہمارے پاس تو ایسی کوئی وجہ نہیں ہے۔۔ رامیش نے پھر احمد کی ٹانگ کھینچتے ہوئے کہا تھا۔

" کیوں مالک رامیش سچ کہہ رہا ہے؟ وکٹر کے انداز میں اب تھوڑی ناگواری شامل ہوگئی تھی۔۔

احمد ملک، جواب صرف مالک بن کے رہ گیا تھا۔ خاموشی سے بس سر کو آگے پیچھے ہی ہلا سکا۔۔

" کیا کرتے ہو؟ شکاگو سے بگ باس آرہے ہیں اور یہ ملنے ملانے کا نایاب موقعہ

ہوتا ہے اور تم اسے ہر سال ضائع کر دیتے ہو"۔۔ وکٹر کا موڈ مزید غصے کی طرف جا رہا تھا مگر اسی لمحے گلوریا رحمت کا فرشتہ بن کر آ گئی تھی۔

"خیریت ہے تم سب لوگ اس معصوم کی میز کے گرد کیوں گھیرا ڈالے کھڑے ہو؟ کیا یہ کوئی اہم اعلان کرنے والا ہے یا اس کے بارے کوئی اہم اعلان ہونے والا ہے۔۔؟
" اتنی سی بات پر رامیش اور وکٹر یوں قہقہہ مار کر ہنسے جیسے اس صدی کا سب سے بڑا لطیفہ سنایا گیا ہو۔۔

احمد کی زندگی کا یہ بھی ایک اور بہت بڑا دکھ تھا، جب سے وہ کینیڈا آیا تھا، یا جب سے اس دفتر میں آیا تھا، اسے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کس بات پر قہقہہ مارنا ہے اور کون سی بات صرف زیرِ لب مسکرا کر چپ کر جانے والی ہے اور کس بات پر بھرپور حیرت کا اظہار کرنا ہے۔ وہ ہمیشہ ہی ترتیب الٹی کر دیتا تھا کہ ہنسنے والی بات پر خاموش رہتا تھا اور خاموش رہنے والی بات پر اس کا تنہا قہقہہ گونج اٹھتا تھا، اس بات سے بھی اس کا باقی لوگوں کے ساتھ ایک بیگانگی کا پردہ برقرار رہتا تھا جو اسے شدت سے احساس دلاتا تھا کہ وہ ان میں سے نہیں ہے۔۔

رامیش اور ساجد اس کے جیسے ہونے کے باوجود اس خیال کو اور بھی تقویت پہنچانے کا باعث بنتے تھے۔

" مالک، ائیر اینڈ کلوزنگ کا دارومدار تم پر ہی ہے، کچھ نمبرز کو آگے پیچھے کرنا ہے"۔۔ وکٹر کے موڈ ایسے ہی عورتوں کی طرح بدلتے رہتے تھے، اسی وقت اس نے رامیش اور گلوریا کی طرف دیکھتے ہوئے احمد کی تعریف کی تھی" نمبرز میں یہ شخص کمال ہے"۔

گلوریا نے اس پر بھرپور تعریفی نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا" اس میں کیا شک ہے کل رات بھی مالک کے کام کی تعریف کر رہا تھا"،

گلوریا کے منہ سے بنک کے صدر کے اس کے لئے تعریفی الفاظ سن کر وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اسے ہمیشہ صرف یہ زبانی کلامی تعریف سے ہی ٹرخا دیا جاتا ہے، ترقی دیتے ہوئے یہ کم بخت لچک مچک آڑے آجاتی ہے۔

مگر رامیش سے اس کی یہ زبانی تعریف بھی برداشت نہیں ہوئی تھی، احمد نے اس سنہری لمحے کو جس میں رامیش گھبرا کر تھوک نگل رہا تھا، آنکھوں میں بسا لیا تھا، پورے سال کی راحت کا سامان تھا اس ایک تصویر میں اور اسے رامیش کی بے بسی پر بڑا مزہ آیا تھا، مگر اس کی خوشی اور مزا زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہا تھا، جلد ہی اس چالاک لومڑ نے کایا پلٹ دی تھی۔۔

"وکٹر تمھیں پتہ ہے مالک بہت funny ہے کل کہہ رہا تھا" پرائڈ پریڈ" کو" پرائڈ پریڈ" کہنا کتنی بے وقوفی کی بات ہے، اس میں بھلا" پرائڈ" والی کیا بات ہوتی ہے؟ جس چیز کو چھپانا چاہیئے اسے پرائڈ بنا کر بے شرمی سے پریڈ کی جاتی ہے۔ ہاہاہا"۔ رامیش نے وکٹر کی گلابی شرٹ اور کان کے بالے کو پیار سے تکتے ہوئے کہا تھا۔۔

وکٹر کا رنگ ایک دم کپاس کے پھول جیسا ہو گیا تھا اور احمد کے تو جیسے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے تھے۔۔

"میں تو کہہ رہا تھا ایک غیر فطری۔۔ میرا مطلب غلط کام،، میرا مطلب۔"۔۔ وکٹر کے سامنے اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ہم جنس پرستی کے خلاف اپنے خیالات کو کس طرح چھپائے۔۔

"میں میں کیا مالک، تم کہہ رہے تھے نا کہ یہ نہیں ہونا چاہیئے"۔۔ رامیش اب اس کی ٹانگ کھینچ نہیں بلکہ چبا رہا تھا۔۔" تو میں نے سوچا ساجد سے پوچھوں، وہ تو تمھارے ہی مذہب اور ملک کا ہے، مگر وہ تو تم سے بالکل مختلف ہے، اسے میری طرح آزادیٔ اظہار پر

یقین ہے۔ انسان کی آزادی پر، جو دل کرے کرو، جو دل کرے بولو، کھاؤ پہنو، کوئی کسی کو پابند نہ کرے اور اچھائی برائی کے فیصلے خود نہ کرے، ۔۔۔"۔

"رامیش اسی لئے تو تم اس دفتر میں ہر دلعزیز شخصیت ہو۔ تمھاری اچھی سوچ تمھیں اور آگے لے کر جائے گی اور تنگ سوچ والے لوگ ساری عمر ایک میز پر بیٹھے گذار دیں گے۔۔" وکٹر زہر آلود نظروں سے احمد کی میز کو دیکھتے ہوئے اپنے کیبن کی طرف چلا گیا تھا۔۔

احمد کا دل کر رہا تھا، اس مکار کا منہ نوچ لے۔ مگر وہ مکار اب گلوریا پر جھکا اسے کہہ رہا تھا" تم ہی اس کو سمجھاؤ کہ پارٹی میں آجائے، یہی تو سب سے گھلنے ملنے کا موقع ہوتا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے وہ تمسخرانہ انداز سے احمد کو دیکھتا ہوا اپنے میز کی طرف چل پڑا تھا اور گلوریا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے کہا تھا" مالک پارٹی میں آنے کی کوشش کرنا، رامیش سب کا بھلا چاہتا ہے بڑا اچھا انسان ہے۔"

اور احمد میگی کے لمس سے وقتی طور پر اس بھلے انسان کے زہریلے وار کو بھی بھول گیا تھا اور یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اس سال بھی ترقی کے میڈل رامیش یا ساجد کے کندھوں پر سجیں گے اور وہ بس اسی میز پر۔۔۔

اب کاؤچ پر لیٹے ہوئے بھی اسے اپنی اس سال بھی ترقی نہ ہونے کا پیشگی غم کھائے جا رہا تھا مگر ایسے میں پچھلے جمعے کو سنے ہوئے مولوی صاحب کے خطبے نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا اور اس کے خوبصورت الفاظ احمد کے کانوں میں گونجنے لگے:

"دنیا فانی ہے، ایک سراب ہے، اصلی دنیا مرنے کے بعد شروع ہونی ہے۔ اس لئے اس دنیا کی نہیں، اگلے جہاں کے سامان کی تیاری کرنی چاہیئے یا خالی ہاتھ جانا ہے؟

نمازی یک زبان ہو کے بولے تھے۔۔"نہیں"۔

"اللہ کو راضی کرنا ہے تو اس جہاں کی عارضی چیزوں کے پیچھے نہ بھاگو، اللہ سے لو لگا

کے رکھو، کافر ملک میں اپنا ایمان بچا کے رکھو، یہ تمھارے نفس کا جہاد ہے، اس میں سے کامیاب نکل گئے تو آخرت کی مستقل خوشیاں تم لوگوں کا مقدر ہونگی، دنیا کی دوڑ میں لگ گئے اور عیش وعشرت میں پڑ گئے تو جہنم کی آگ میں جلا دیئے جاؤ گے"

مولوی صاحب کا خطبہ یاد آتے ہی اسے دفتر کے تمام لوگ بدنصیب اور جہنمی لگنے لگ گئے۔ رامیش اور ساجد اپنا ایمان بیچ کر دنیا کی ترقی لے سکتے ہیں مگر میری طرح وکٹر کے غیر فطری اور غیر اسلامی طریقے کو بہادری سے تنقید کا نشانہ نہیں بنا سکتے، وہ شراب اور خوشامد کے سہارے ترقی پا بھی لیں تو میری طرح دوسری مستقل دنیا میں سرخرو نہیں ہونگے اور پھر مجھے دنیاوی عارضی ترقی سے کیا لینا۔۔؟ میری منزل تو آخرت کا سامان اکٹھا کرنا ہے۔۔" مگر۔۔۔۔۔۔کاش، یہ کم بخت اس دنیا میں بھی ترقی نہ پائیں۔

خطبے کے الفاظ میں پناہ لینے کے بعد بھی وہ سوچ رہا تھا کہ کاش ان مردُودوں کی ترقی بھی نہ ہو۔۔ اسے اپنی ترقی نہ ہونے کا اتنا غم نہیں تھا جتنا ان دونوں کی" ہو جانے" کا تھا۔

"ساجد تو پکا دوزخ کی آگ میں جلے گا پھر دیکھوں گا کیسے کافر رامیش اور وکٹر اسے بچانے آئیں گے"۔اس کی بڑبڑاہٹ آواز بن گئی تو، ریحانہ لانڈری سے نکل کر کچن کی طرف جاتے ہوئے رک گئی اور اسے دیکھ کے بولی:

"تم نے جو جنت میں پلاٹ پکا کروایا تھا، اس کی رجسٹری آ گئی ہے؟"

"اس فانی دنیا میں، میں رامیش سے بھی اپنے ساتھ کسی اچھائی کی امید کر سکتا ہوں مگر تم سے نہیں، تم جب اگلنا، زہر ہی اگلنا۔۔ دو میٹھے بول تمھارے پاس نہیں ہیں؟"۔۔احمد اس امید پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا کہ اب نارمل لڑائی شروع ہونے ہی والی ہے۔۔

مگر یہ کیا ریحانہ نے اس کی طرف وہی خاموش گھوری اچھالی اور تیزی سے کچن کی

طرف نکل گئی، اب یہ ذلت آمیز بے رخی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔" دل تو چاہ رہا ہے اس بدلحاظ عورت کے پاس جاؤں اور اسے مولوی صاحب کے خطبے کے وہ حصے سناؤں جس میں انہوں نے بیویوں کے فرائض پر اتنی شاندار روشنی ڈالی تھی۔۔ لیکن پھر شکر ہے وقت پر ہی اسے خیال آ گیا کہ اب یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا جب سے ریحانہ نے درس پر جانا شروع کیا تھا اسے قران اور حدیث کی وہ سب باتیں ازبر یاد تھیں، جن میں عورتوں کے حقوق پر بات کی گئی تھی۔ اور ان کی روشنی میں ایسے لگتا تھا جیسے یہ زمینی عورتیں نہیں بلکہ وہ حوریں زمین پر اتر آئی ہیں جن کے ملنے کا وعدہ جنت میں جانے کے بعد کا ہے۔

بات اسلام تک ہی رہتی تو وہ مولوی صاحب کی مدد سے سنبھال سکتا تھا مگر جب سے ریحانہ کی ایک دوست نے پیرالیگل کا امتحان پاس کر لیا تھا، احمد کا امتحان شروع ہو چکا تھا اور اب بات اس کے قابو سے باہر ہو چکی تھی۔ وہ سہیلی، ریحانہ کو ایسی قانونی سمجھ دے چکی تھی کہ وہ، ریحانہ کم اور راکھشس زیادہ لگنے لگی تھی۔ اس نے سوچا اب مولوی صاحب کو جمعے والے دن زیادہ چندہ دوں گا اور کہوں گا کہ درس والی اور قانون والی دونوں کی باتوں کے توڑ والی کچھ ایسی پر اثر حدیثیں سنائیں کہ یہ بدذات عورت قابو میں آ جائے۔۔ یہ سوچ کر اس کے دل کو کچھ تسلی ہوئی۔

" کینیڈا آ کر تو سب کچھ ہی بدل گیا تھا۔ لوگوں کا نہ دین رہا تھا نہ ایمان۔ شکر ہے میں نے آفس کے اور گھر کے محاذوں سے تنگ آ کر دین کی راہ نہیں چھوڑی ورنہ میرے دوست آصف کا حال تو سامنے ہی ہے، وہ بھی کیسا کیسا کفر بکنے لگ گیا تھا، اچھا کیا میں نے اس سے دوستی چھوڑ دی "۔

اسے یاد آیا جب آصف نے بڑے دکھ سے بتایا تھا کہ "دیکھو یہ مولوی کیا کرتے پھر رہے ہیں؟"۔

اور بات بھی کس مولوی کی کر رہا تھا، جس کے کہنے پر احمد نے نماز شروع کی تھی اور جس کی وجہ سے بےشرم اور آزاد ملک میں اپنے ایمان کو سلامت رکھے ہوئے تھا۔ اس اللہ والے کے بارے میں آصف اول فول بک رہا تھا، کہ انہوں نے کہا ہے کہ:

"اپنے کلائنٹس کو کہنا کہ مسجد کو اگر وہ سو ڈالرز کی ڈونیشن دیں گے تو مسجد انہیں پانچ سو ڈالر کی رسید دے گی تا کہ وہ ٹیکس میں ظاہر کر کے ریونیو کینیڈا سے زیادہ وصولی کر سکیں۔"

"ایسا دہریہ ہو گیا تھا کہ مولوی صاحب پر ایسا غلیظ الزام لگاتے ہوئے ذرا بھی شرمسار نہیں تھا، کہاں مولوی صاحب جن کے ماتھے پر محراب کا نشان چمکتا ہے اور کہاں یہ بے دین، بے ایمان شراب پینے والا انسان، شرم ہی نہیں آتی لوگوں کو، کینیڈا میں آ کر خدا کو بھول بیٹھے ہیں۔ اللہ ہی ان سے پوچھے میں تو تھک گیا ہوں۔"۔

کچن سے برتن پٹخنے کی آوازیں آ رہی تھیں اس نے نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر لیں مگر یہ کیا آنکھیں بند کرتے ہی گلوریا کا نرم گرم وجود چھم سے سامنے آ کھڑا ہوا۔" کیسی پیار لٹاتی، نرم زبان کی لڑکی ہے، کتنے پیار سے اس نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا تھا"

مگر افسوس وہاں بھی اس کے کانوں میں مولوی صاحب کے الفاظ چیختے چنگھاڑتے آ پہنچے تھے، اور اس نے گلوریا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا، یہ اور بات ہے کہ جھکی آنکھوں کے آگے ننگی سڈول پنڈلیاں آ ٹکی تھیں۔۔ نعوذ باللہ۔۔ اب بھی دیکھو خیالوں میں کیسے وہی پنڈلیاں بے دھڑک گھسی چلی آ رہی ہیں۔

"لاحول ولا قوۃ، عورت کے چلتر، ان سے کون بچ سکا، یہی تو جہاد ہے بھیا"۔ احمد نے بند آنکھوں کے پیچھے سے اپنی پیٹھ تھپکی۔

چائے نوش فرما لی ہو تو میں کچھ بکوں؟ گلوریا کی ملائم شکل ایک دم بیوی کی کرخت

آواز میں بدل گئی۔۔۔

"ٹن ٹن"۔۔۔ خطرے کے الارم نے اس کے جسم کو جھنجوڑ دیا۔۔۔" آؤ آؤ کیوں نہیں"۔۔ اس نے خوفزدہ ہو کر پیار سے بیوی کو پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بیٹھنا کیا؟ بیٹھ تو تم گئے ہو مسٹر احمد، یہ لو تمھارے نام بنک کا محبت نامہ آیا ہے" ۔۔۔ بیوی کی آواز میں کرختگی بڑھتی جا رہی تھی۔۔

"کیا ہے اس میں؟!" ابھی بھی بات احمد کی سمجھ سے باہر تھی۔۔

"اس میں یہ ہے کہ بنک کو آپ 50000 ڈالرز حق مہر دے دیں"۔۔ بیوی نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"کیا مطلب؟!" حمد نے لفافہ جلدی جلدی کھولتے ہوئے کہا اور بنک کا 50000 ڈالرز جمع کروانے کا نوٹس پڑھ کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔۔

"دیکھو بنک کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے، بیوی کے غیض وغضب کو قابو کرنے کی ایک کمزور سی کوشش کی۔۔

"غلط فہمی بنک کو نہیں تمھیں ہوئی ہے۔۔" بیوی غرائی۔

نامعلوم کی پر اسراریت غائب ہو چکی تھی اور اب گھر کی فضا نارمل سے بھی زیادہ نارمل تھی، بیوی کے ماتھے کی تیوری اور لال رنگت احمد کی آنکھوں کے آگے ناچ رہی تھی، اور باقی سب اندھیر ہو چکا تھا۔

"کیا کہا تھا میں نے تمھیں؟ کہا تھا نا کہ اس بچت سے بچوں کے لئے کوئی اپارٹمنٹ بُک کروا لو اور تم نے کیا کہا تھا۔۔ یاد ہے؟ بیوی نے اس کی ٹھوڑی گردن سے اُٹھاتے ہوئے کہا۔۔" تم نے کہا تھا نہیں جنت میں گھر پکا کروانا ہے، اب کراؤ جنت میں

ایڈوانس بکنگ۔۔تم تو دنیا میں کہیں کے نہیں رہے، اب ماتم کرو بیٹھ کر۔۔بیوی اب صرف دھاڑ رہی تھی۔

"جذباتی نہ بنو، اپنے آپ کو کنٹرول کرو، کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، مجھے کسی سے بات تو کرنے دو۔۔وہ ایک سانس میں بولے جا رہا تھا۔۔

"یہ لو کرو بات، مگر میری نہیں، اپنی غلط فہمی دور کرو"۔بیوی نے پلک جھپکتے ہی فون اس کے ہاتھ میں دے مارا۔۔

کانپتے ہاتھوں سے مولوی صاحب کا نمبر ملایا، نمبر ملتے ہی دوسری جانب سے نہایت میٹھی سی آواز میں "ہیلو" کہا گیا۔

"میری مولانا فرقان صاحب سے بات کروائیں۔۔جلدی!۔۔"۔احمد نے سانس لئے بغیر مدعا بیان کر دیا۔۔

"مولانا صاحب تو حج کے لئے تشریف لے جا چکے ہیں" دوسری طرف سے اسی میٹھے لہجے میں بتایا گیا۔

"کیسے؟ کیوں؟" احمد بے تابی سے چیخا۔۔

"ہیں؟ یہ کیا سوالات ہوئے، پھر بھی بتائے دیتا ہوں، کیوں کا جواب ہے کہ یہ اسلام کا بنیادی رُکن ہے اور ہر صاحب استطاعت مسلمان کا فرض ہے، اور کیسے کا جواب یہ کہ ہوائی جہاز کے ذریعے، حج کا پورا گروپ لے کر گئے ہیں ماشااللہ سے۔۔"۔آواز کی مٹھاس احمد کے دل کو نہ سنبھال سکی۔۔

"حضرت آپ کون ہیں" احمد نے بے تابی سے میٹھے انسان سے پوچھا۔

"میں مولانا فرقان صاحب کا نائب قاری حفیظ ہوں" اب آواز میں مٹھاس کے

ساتھ ہلکا سا رعب بھی شامل ہو چکا تھا۔

بیوی کمر پر ہاتھ رکھے اسے مسلسل گھورے جا رہی تھی اور وہ بے یقینی کے گہرے سمندر میں اندھادھند ہاتھ پاؤں مار کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا:

"دیکھئے میرا نام احمد ملک ہے، شائد مولانا فرقان نے آپ سے میرا ذکر کیا ہو، قاری صاحب! میں نے آپ کو مولانا فرقان کے ساتھ کبھی نہیں دیکھا مگر میں آپ کو بتاتا ہوں، میں نے مولانا صاحب کی درخواست پر مسجد بنانے کی غرض سے اپنا پلاٹ دے دیا تھا۔۔"

"اچھا تو پھر جناب؟ اللہ کا گھر بنانے کو دیا تھا یا پھر مولانا صاحب کو ذاتی گھر بنانے کے لئے؟" میٹھی آواز میں ایک دم سے بے رخی اتر آئی۔

"اللہ کے گھر کے لئے ہی دیا تھا، مگر آپ میری بات نہیں سمجھ رہے۔ مجھے بنک سے نوٹس آیا ہے کہ چھ مہینے سے بنک کو اس پلاٹ کی مارگیج نہیں گئی ہے اور بنک نے پلاٹ پاور آف سیل پر بیچ دیا ہے مگر پھر بھی بنک کو پچاس ہزار ڈالرز کا نقصان ہو رہا ہے اور چونکہ پلاٹ میرے نام ہی ہے اس لئے بنک نے مجھے یہ پیسے فوراً جمع کروانے کو کہا ہے، آپ کو سمجھ آ رہا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔" سمجھاتے سمجھاتے احمد کا گلا خشک اور آنکھیں تر ہو گئیں۔

"اوہ اچھا آپ اس ویران پلاٹ کی بات کر رہے ہیں، قبلہ، مولانا صاحب کا خیال یہ تھا کہ آپ کے پلاٹ پر مسجد بنانا فائدہ مند نہیں ہے، کیونکہ وہاں مسلمان کم رہتے ہیں اس لئے نمازیوں کی تعداد کم ہوگی اور اسی وجہ سے مسجد کو چندہ کہاں سے ملے گا اور اخراجات کہاں سے پورے ہونگے؟ آپ ایک پلاٹ دے کر بری الزمہ ہو کر بیٹھ گئے تھے، مولانا

صاحب کو سب سوچنا پڑتا ہے، آپ ذاتی نفع نقصان کو رو رہے ہیں، مولانا صاحب نے اللہ اور اس کے گھر کے وسیع ترین مفاد کو مدنظر رکھنا ہوتا ہے۔۔ہم نے تو الحمداللہ نئی مسجد کی کسی اور جگہ تعمیر بھی شروع کروادی ہے۔۔وہاں اللہ کے فضل سے مسلمان آبادی خوب ہے۔۔۔سمجھے آپ؟" قاری صاحب نے انتہائی وقار سے اپنی بات ختم کی۔۔۔

"قاری صاحب آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔اگر مولانا صاحب نے یہ فیصلہ کر ہی لیا تھا تو کم از کم مجھے اطلاع تو کر دیتے تاکہ میں اپنے پلاٹ کی قسطیں خود دیتا تو رہتا، آپ نے تو مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔۔۔برباد ہو گیا ہوں میں۔۔کہاں سے دوں بنک کو پچاس ہزار ڈالرز۔۔پلاٹ سے الگ ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔۔کیا کروں میں۔۔آپ کو سمجھ آرہی ہے؟"اب احمد باقاعدہ رونے لگ گیا۔۔بیوی کا ہاتھ بھی کمر سے ہٹ کر تسلی دینے کے لئے احمد کے کندھے پر آٹکا۔

"دیکھئے حضرت مولانا صاحب کو الزام نہ دیں۔آپ نے پلاٹ اللہ کا گھر بنانے کے لئے اللہ کے حوالے کیا تھا تو مولانا صاحب کیوں ڈاکئے بن کر آپ کو اطلاعات پہنچاتے رہتے؟ آپ کا اور خدا کا معاملہ ہے بھائی، ہمیں نہ درمیان میں گھسیٹیں۔"

"مجھے مولانا صاحب نے کہا تھا اُس مسجد میں جتنے سجدے ہونگے، فی سجدہ مجھے دس نیکیوں کا ثواب ملے گا اور ساتھ میں جنت میں گھر ملے گا، میں نے تو جنت اور نیکیوں کے لالچ میں اپنی دنیا ہی اُجاڑ دی، میں نے اپنی ساری جمع پونجی آنکھیں بند کر کے مولانا کے ہاتھ پر دھر دی تھی۔۔اور یہ صلہ ملا مجھے۔۔۔؟۔"

قاری صاحب نے احمد کی بات درمیان میں ہی اُچک لی:

"اپنے آپ سے پوچھیں کہ آپ نے کیا گناہ کئے ہیں کہ خدا نے آپ کی یہ بخشش قبول نہیں کی؟ اپنی زندگی کا جائزہ لیں کیا غلطیاں سرزد کر بیٹھے ہیں کہ اللہ نے آپ کو یہ مقام

نہیں دیا؟ آپ کے مقدر میں سجدوں کا ثواب کیوں نہیں تھا؟ اپنے گناہوں کی توبہ کریں، اپنی نیت کو جانچیں، ہم اللہ والوں کو کس دنیاوی جھنجٹ میں گھسیٹ رہے ہیں، یعنی کہ ایک اور گناہ کما رہے ہیں۔۔اللہ توبہ کریں جی"۔۔وعظ طول ہی پکڑتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ احمد کے کانپتے ہاتھوں سے ریسیور پھسل گیا اور اسے لگا اس کے جسم سے کوئی آہستہ آہستہ جان نکال رہا ہے۔

اس رات اسے عجیب عجیب خواب آتے رہے۔ایک لمبی سی سیڑھی ہے جو آسمانوں تک جاتی ہے، رامیش اور ساجد اس پر پھلانگتے ہوئے نجانے کہاں سے کہاں نکلتے جا رہے ہیں، بنک کا لفافہ اڑوس پڑوس کی چھتوں پر ناچتا پھر رہا ہے، جس گھر کی چھت پر جاتا ہے اُسی کے مکین اسے کھول کر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، وکٹر کی گلابی شرٹ احمد کی گردن میں ٹائی کی طرح لٹک رہی ہے، اور ایک چہرہ جو کبھی ریحانہ کا بن جاتا ہے اور کبھی گلوریا کا، اسے چوم رہا ہے۔پھر ایک عورت کا بے لباس جسم ہے جو اس کے ساتھ محوِ رقص ہے، مولوی صاحب شراب پی کر نماز پڑھنے کی جھوم جھوم کر تلقین کر رہے ہیں، نمازی مسجد کی بجائے شراب خانوں میں سجدے کر رہے ہیں۔۔۔۔ایک بے ہنگم سا شور ہے جو اس کے کان پھاڑے دے رہا ہے اور وہ چیخ مار کر اٹھا تو اس کا سارا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔۔۔کچھ ہوش آئی تو دیکھا صبح کا سورج تو طلوع ہو چکا تھا مگر اندھیرا ابھی وہیں تھا۔۔

حسبِ معمول تیار ہو کر، دفتر کے لئے گھر سے نکلنے لگا تو بیوی کی کچن سے آواز آئی
"آج کوشش کرنا جلدی گھر آجاؤ، مسز تنویر نے نئے سال کے لئے اپنے گھر میں قران خوانی رکھی ہے تو وہاں اپنے لئے بھی دعا کروالیں گے شائد اللہ ہمیں اس مشکل سے نکال دے"

"مگر میرے دفتر میں آج نیو ائیر کی پارٹی ہے، اس لئے میں آج جلدی گھر کسی قیمت پر نہیں آسکتا۔۔"اس نے ایسے ٹھوس اور سرد لہجے میں کہا کہ بیوی کی ہڈیاں سننا

اٹھیں۔۔۔

" مگر تم تو دفتر کی ایسی پارٹیوں میں کبھی نہیں جاتے۔"

" مگر آج میں وکٹر کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا ہوں، جو وہ کہے گا ویسے ہی کروں گا اور پھر دیکھوں گا کیسے یہ ساجد اور رامیش ترقی کرتے ہیں۔" وہ اتنا آہستہ بولا جیسے صرف خود کو ہی بتا رہا ہو۔

" کیا کہا؟ بیوی کو اس کی آواز ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہی تھی۔

" کچھ نہیں کہا"۔۔اور دروازے کی طرف تیزی سے چل دیا جیسے ذرا سی دیر ہو گئی تو نئے ارادے پھر نہ کہیں ڈھے جائیں۔

" لنچ تو لیتے جاؤ"۔۔ بیوی پیچھے بھاگی مگر بھنے حلال گوشت کا ڈبہ اس کے ہاتھ میں ہی رہ گیا اور مالک نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔۔اندر آ کر ریحانہ نے دیکھا، آج احمد کی جاءنماز کی تہ نہیں کھلی تھی۔۔نماز قضاء ہو چکی تھی اور دنیا کے کام کاج کا وقت شروع ہو چکا تھا اور آج لگتا تھا احمد نہیں مالک گھر سے نکلا ہے۔

لا یموت

"صدیوں بعد بھی ملو گی تو کیا ایسی ہی رہو گی؟" قیصر نے سگریٹ کا دھواں سامنے بیٹھی عورت کے منہ پر چھوڑتے ہوئے کہا۔

"اور تم جب بھی ملو گے یونہی میرے حسن سے جلتے رہو گے"؟" دیکھو باہر اندھیرا پھیل گیا ہے"۔عورت نے سگریٹ کے دھویں کو سانس میں بھرتے ہوئے کہا۔

"تم ابھی تک اندھیرے سے سہمتی ہو؟ میں تو اب چٹے سفید دن سے ڈرتا ہوں۔"

" قیصر! کیا تمھیں روشنی سے کوفت ہونے لگ گئی ہے؟ تم جو مجھے ساری رات فون پر باتوں میں یہ لالچ دے کر لگائے رکھتے تھے کہ، رک جاؤ، اکھٹے سورج کو آسمانوں سے اگتا ہوا دیکھیں گے۔

"صوبی! کیا تمھیں پتہ نہیں چلا کہ ہم دونوں ایک سا سورج کبھی نہیں دیکھ سکتے۔تو پھر بولو اب اس روشنی سے میری کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

ہاہاہا۔۔۔ہاہاہاہا۔۔۔اس کے قہقے سے دھواں دائروں میں گھومنے لگا۔

ابھی بھی ویسے ہی ہنستی ہو، بریکیں لگا لگا کے؟

"ہاں تو اور کیا" وہ چہکی" میں نہیں بدلی"۔۔

"ہاں مگر آنکھیں بدل گئی ہیں، جاؤ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھو ہنستی ہو تو آنکھیں چہرے کا ساتھ چھوڑ جاتی ہیں۔۔"

"تم نے کون سا ان آنکھوں کی پرواہ کی؟ کہاں تھے اتنے سالوں سے؟ تم جانتے تھے نا کہ تمھارے علاوہ میرا کوئی دوست نہیں تھا، جاؤ! تُم نے تب پرواہ نہ کی تو اب کیا کرو گے؟ باہر اندھیرا ہو گیا یا آنکھیں مجھے چھوڑ گئیں، تمھیں اس سے کیا؟

"دل پر اور بوجھ نہ بڑھاؤ، احساس گناہ نہ دو، میں اب بہت کم زور ہو گیا ہوں، تمھارے منہ سے نکلے ہر لفظ کو پورا کرنے والا "قیصر" نہیں رہا".

"میں بھی بغیر سوچے فرمائیشیں کرنے والی صوبیہ نہیں رہی، جانتے ہو میں تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ تم نے مجھے اتنے لاڈ دیئے، میرے باپ بن گئے، میرے بھائی بن گئے میرے دوست بن گئے یہاں تک کہ میری ماں بھی بن گئے اور پھر اچانک، بے آسرا چھوڑ گئے، زمانے کے رحم وکرم پر۔۔جانتے ہو۔۔۔۔۔؟"

مجھے معاف کر سکتی ہو؟ وہ میز کے دوسری طرف سے اٹھا اور عورت کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"مجھے ٹوکو نہیں، بولنے دو، تم میرے گنہگار ہو"۔۔وہ پتھر کی طرح بیٹھی رہی۔

"ہاں پتہ ہے, اس لئے تمھارے سامنے سر جھکایا ہوا ہے, رونے کو تمھیں اپنا کندھا نہیں دے سکتا, اپنے ہاتھوں سے تمھارے آنسو نہیں صاف کر سکتا بس تمھارے آگے اپنا سر جھکا سکتا ہوں۔۔جانتی ہو نا میں نے تمھارے سامنے پہلا سجدہ کب کیا تھا؟ تمھیں کیسے پتہ ہو گا میں نے تو یہ کبھی تمھیں بتایا ہی نہیں، کالج کے شروع شروع کے دن تھے اور تم اپنی کلاس کے سامنے کھڑی تھیں، میں نیچے گراؤنڈ میں دوستوں کے ساتھ تھا، کسی لڑکے نے تمھارے متعلق کوئی بات کی اور اسی لمحے تم نے بال جھٹک کر غیر ارادی طور پر ہماری سمت ہی دیکھا تھا۔ جیسے تمھاری چھٹی حس نے تمھیں بتا دیا ہو کہ کہیں دور لڑکوں کے ٹولے میں تمھاری بات ہو رہی ہے۔ اس دن تمھارے اور میرے درمیان بہت فاصلہ تھا، مگر مجھے آج بھی نیلے رنگ

کا وہ سوٹ یاد ہے جس میں تمھارا چہرہ چمک رہا تھا، تمھاری آنکھوں پر بال گرے ہوئے تھے، جنہیں تم نے جھٹکے سے پیچھے کیا تھا اور میں تو بس وہیں پر زمین دوز ہو گیا تھا۔۔"

"تمھارے زمین دوز ہونے کا کیا ہے, یاد ہے جب تمھیں ماریہ سے عشق ہو گیا تھا تم نے سب سے پہلے یا شائد اسے بتانے کے بعد مجھے فون پر بتایا تھا، تمھارے الفاظ آج بھی میرے کانوں میں ایسے گونجتے ہیں جیسے کل ہی کی بات ہو، تم نے کہا تھا" اس نے مجھے آواز دی ہے"۔ اگلے دن ہمارا سالانہ امتحان تھا، مگر میرے امتحان کی گھڑی شائد وہی تھی۔"

"ہاں تم نے مجھے ہولڈ کروایا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ تم مجھے روکو گی۔۔تم مجھ سے نہ جانے کی بھیک مانگو گی مگر تم تو ہنستی مسکراتی واپس آ گئی۔۔"

"میں نے کیوں روکنا تھا، میں نے کون سا تم سے شادی کرنی تھی، اس کے باوجود اس وقت مجھے پتہ نہیں کیا ہوا تھا، تمھیں ہولڈ کروا کے گئی اور جا کر ٹوائلٹ میں قے کر آئی"

"اوہ! وہ تم قے کر کے آئی تھی؟ میں نے سوچا شائد تمھاری امی نے آواز دی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے آ کر تم نے یہی کہا تھا."

"ہاں تو اور کیا کہتی؟ جانتے ہو نہ مجھ سے اصلی بات نکلوانا کتنا مشکل کام ہوتا تھا، مگر تم تو میرا چہرہ پڑھ لیتے تھے، آواز سے پہچان لیتے تھے کہ میں خوش ہوں یا اداس۔۔خیر اس زمانے میں اداسی کا صرف لفظ ہی آتا تھا، اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن شائد اس دن تم نے مجھے جان بوجھ کے اگنور کیا تھا، مجھے اپنی محبت کا حال سنا کے تم بری الزمہ ہو گئے اور بس بہت خوش تھے کیونکہ تمھاری محبت نے تمھیں آواز جو دے دی تھی، میں تو ایکدم سے تمھارے لئے فالتو سی ہو گئی تھی۔"

"لڑکی مجھے یہ بتاؤ تم نے مجھے روکا کیوں نہیں؟

"کس لئے روکتی اور کیا ایسی حالت میں جب کہ مَیں تمھاری خوشی ٹیلی فون سے سن سکتی تھی، تمھیں میری روکنے کی صدا سنائی دیتی؟ کیا تم رک جاتے؟

"تمھاری قسم رک جاتا۔۔۔

" مگر میں کیوں روکتی پھر مجھے تم سے شادی کرنی پڑ جاتی، مجھے تو بس تمھاری عادت سی ہوگئی تھی، کبھی کسی نے اتنے لاڈ پہلے کئے جو نہیں تھے۔"

"پاگل لڑکی اپنے لاڈ اٹھوانے کو ہی روک لیتی۔۔"

"ماریہ کی خوانخوار نظروں کا مقابلہ کون کرتا، وہ تو ویسے ہی مجھے کچا کھانے کو تیار رہتی تھی؛ وہ تم سے بہت محبت کرتی تھی۔ اور میں اپنے آپ سے محبت کروانے کے لئے تمھیں اس کی دیوانہ وار چاہت سے کیوں محروم کرتی؟ کس ناطے سے؟ مگر یہ بھی سچ ہے کہ وہ خبر میرے لئے صدمے سے کم نہیں تھی، تب انا کے زور میں کبھی اقرار نہیں کیا مگر اب بتا رہی ہوں کہ میں آج بھی اس صدمے سے کبھی سنبھلی نہیں، شادی شدہ ہو کے بھی، دو بچوں کی ماں ہو کے بھی نہیں۔۔شادی سے پہلے جب بھی کسی نے میرے قریب ہونے کی کوشش کی، دوستی کا ہاتھ بڑھایا، اس دن کی گئی قے نے آگے بڑھ کر میرا راستہ روک لیا اور میں زندگی میں کبھی کسی کو تمھاری جگہ نہیں لا سکی۔ میرے اندر کا دروازہ سختی سے بند ہی رہا۔"

"ہوں!!!۔اسی لئے اپنے آپ کو تمھارا گنہ گار سمجھتا ہو، لیکن تم سدا کی بدھو ہی رہنا، اب خدا سے کیا شکایت کرتا رہوں کہ تمھیں حُسن تو دے دیا مگر عقل نہ دی، پاگل تمھارے پاس جب آیا تھا کسی سے محبت کا بتانے نہیں تم سے تمھاری محبت کا پوچھنے آیا تھا اور ہنس نہیں رہا تھا، تمھاری قسم اپنے آنسو کنٹرول کر رہا تھا مگر تم سدا بدھو ہی رہنا۔۔"

"پتہ نہیں!! بس تم میرا سایہ تھے، ایک دفعہ اس سایے سے جدا ہونے کے بعد میں تمام سایوں سے بھاگتی ہی رہی۔۔بس تنہائی کی عادت ڈال لی۔۔"

" تنہائی اور تم۔؟ چوبیس گھنٹے پارٹیوں میں جاتی ہو چالاک لومڑی۔"

تو کیا پارٹیوں میں تنہائی نہیں ہوتی؟ ہجوم میں اکیلی تمھاری سہیلی"۔۔ہاہاہا کیسا عنوان ہے؟ اس پر نظم لکھنا، سنو پاگل لڑکے، میری اپنی محفل امتحان سے پہلے والی بس اسی رات تک ہی تھی، جب ہم نے آخری دفعہ اکٹھے سورج دیکھا تھا، قیصر! اس وقت تم پر تو محبت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، چلو محبت بھی کر لی مگر یہ کیا کہ شادی کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا؟ چلو بینڈ بھی بجوا لئے مگر یہ کیا مجھ سے دوستی ہی چھوڑ دی، میری طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا، میری چھوٹی چھوٹی فرمائشیں اور میرے مان ایسے کسی چوک میں لاوارثوں کی طرح تمھارا منہ تکتے رہے، میرے دکھ سکھ کی کوئی سہیلی نہ رہی۔تم نے شادی کر کے مجھ سے میرا باپ، میرا بھائی اور میری سہیلی سب چھین لیا تھا"۔

" کیا تم مجھے کبھی بھی معاف نہیں کرو گی؟"

"قیصر خدا کے واسطے اب آنسو مت بہاؤ، یہ بتاؤ جب میں اپنی شادی کے بعد زمانے کی ٹھوکریں کھا رہی تھی تو تم کہاں تھے؟ میرا دل اب نہیں پگھلے گا، مت رو، میں اب بہت ڈھیٹ ہو چکی ہوں مگر پھر بھی پتہ نہیں کیوں وہی سالوں پہلے والی قے منہ میں آ آ کر لوٹ رہی ہے۔"

"افسوس تو یہی ہے کہ اتنے سال گذرنے کے بعد بھی تم ڈھیٹ نہیں ہوئی، آج بھی ویسی ہی معصوم ہو، جو کتابوں میں محبت ڈھونڈتی تھی، جس کی آنکھوں پر بال گرے رہتے تھے اور جس کا دل لوگوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ٹوٹ جاتا تھا، صوبی تم آج بھی ڈھیٹ ہو جاتی تو اپنے آپ کو تمھاری طرف سے خود ہی معافی دے دیتا مگر تم ہزار سال بعد بھی ایسی ہی رہو گی۔

"تم جیسا دوست پھر کبھی نہیں ملا، پھر کبھی کسی نے سورج ساتھ دیکھنے کی بے ضرر سی

ضد میں فون پر پوری رات باتیں نہیں کیں، وقت دولت ہے، بس یہ دولت کوئی کسی پر بلا وجہ ضائع نہیں کرتا، پاک دوستی کی خواہش کے بدلے ہوس ناک نظریں ہی ملیں، لوگ وقت اور بات ناپ تول کر کرتے ہیں۔ تمھارے جیسا گھاٹے کھانے والا کوئی نہیں ملا۔۔"

"تم اپنے شوہر کے ساتھ سورج کو نکلتے دیکھا کرو۔۔ یہ میرا حکم ہے۔"

" کیا تم ماریہ کے ساتھ سورج کو نکلتے دیکھتے ہو؟ تمھاری تو لو میرج ہے۔۔"

" نہیں اتنی ہمت نہیں تھی، اگر یہ بھی کر لیتا تو تمھارے سے آنکھیں کیسے ملاتا؟ بس شادی کے بعد سے ہی ہم میاں بیوی نے اپنے اپنے سورج اپنے اندر ہی اگا لیئے تھے۔ اور جانتی ہو ویسے سورج اب اگتے بھی نہیں، اگر اب کبھی چھت پر اکیلا کھڑا ہو کر اسی طرح ہاتھ میں فون پکڑے سورج کو نکلتے دیکھتا بھی ہوں تو ان کا سنہرا پن نظر نہیں آتا۔۔لڑکی میں نے تمھیں ہر پل یاد کیا، مگر شادی شدہ زندگی کے فرائض سے کبھی نہیں چُوکا، بہت پیار کرنے والا باپ ہوں اور بہت خیال رکھنے والا شوہر۔۔۔"

"خیال تو تمھیں خوب رکھنا آتا ہے۔ محبت کرنا تو کوئی تم سے سیکھے، تیرے سب ٹوٹکے جانتی ہوں مکار لڑکے مگر پھر بھی تمھارے ساتھ سورج دیکھنا چاہتی ہوں۔۔"

"تم میرے ساتھ سورج دیکھنا چاہتی ہو اور میں تمھیں اپنے درد سنانا چاہتا ہوں۔"

"درد؟ واہ جی واہ!! تمہارے کیا درد؟ جس لڑکی نے تم سے محبت کی اور بدلے میں جس لڑکی سے تمھیں محبت ہوگئی، اس کے ساتھ شادی کر لی تو اب کیا دکھ اور کیا درد؟ جاؤ جاؤ کام کرو اپنا، کسی اور کو اب پاگل بنانا۔"

" تمھیں جو میں نے بتایا تھا تم نے وہی سنا، جو دکھایا وہی دیکھا۔ تُو کملی تو ہمیشہ سے میرے پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتی تھی اس لئے تجھے کیا پتہ میرے ساتھ کیا کیا ہوا تھا۔ ماریہ کی فیملی پرابلمز کی وجہ سے میرے امیر اور شریف ماں باپ اسے بہو بنانے کو تیار نہیں

تھے۔ مگر تم تو جانتی ہونا کہ تیرا دوست کتنا ضدی ہے۔ ماریہ جب آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتی تھی ہماری شادی کب ہوگی، تو بس میں جی جان لگا کے اس مسئلے کے حل کے لئے نکل کھڑا ہوتا تھا مگر میرے ماں باپ بھی بڑے سخت دل کے نکلے یار، ماریہ کے والدین کی خوب بے عزتی کی تا کہ وہ ہی انکار کر دیں مگر وہ تیری بہن بھی تجھے پتہ ضدی اور میرے عشق میں پاگل۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ اڑ تو گئے مگر والدین نے شادی کے دن بھی ہم سے بدلہ لیا، میرے سگے بھائی اور ماں برات پر ساتھ نہ گئے اور پھر اس کے والدین نے بھی ولیمے پر آنے سے انکار کر دیا۔ ہماری بہت جگ ہنسائی ہوئی۔۔ اس غم میں ماریہ نے اپنے والدین چھوڑ دئے، اس کی تو سوتیلی ماں تھی، چھوڑنا آسان تھا مگر میری سگی نے جب سوتیلا پن کیا تو میں نے بھی اسے چھوڑ دیا، کون اپنی ماں کو چھوڑتا ہے مگر تیرے دوست نے محبت، یا انا یا ضد، جو بھی تھا کی خاطر یہ بھی کر دکھایا۔۔ پھر ماریہ نے ضد کی کہ بیاہ کے تمھارے خاندانی بڑے سے گھر میں ہی جاؤں گی۔ صوبی، وہ تمھاری طرح موم کی گڑیا نہیں ہے بڑی ہٹ دھرم ہے، میری ماں سے مجھے چھڑوا بھی دیا اور اس کے ساتھ رہنے بھی آ گئی اور میں اسی چکر میں ہر روز ایک نئے عذاب سے گذرتا ہوں۔ اس ساس بہو کی روایتی لڑائی کو چھوڑ یہ غیر روایتی دشمنی نے مجھے ناکوں چنے چبوا دئے۔ بیس سال کی عمر میں کون کمانا شروع کرتا ہے ۔۔۔ بول۔۔ میری اپر کلاس کے کسی لڑکے کو بیس سال کی عمر میں کماتے دیکھا ہے؟ میں حالات سے مجبور ہو کر وہ بھی کرنے لگ گیا اور اسطرح جھوٹ کے بزنس میں ہاتھ لتھیڑ لئے ۔ میری دوست میرا آئیڈلزم برباد ہو گیا، تیرا دوست برباد ہو گیا۔ اب میں خوشی کا، کامیابی کا ماسک لگائے" جوکر" بنا ڈرامے کر رہا ہوں۔ تم میرا آئینہ نہ ہوتی تو کسے بتاتا کہ میں اِس جھوٹ کی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ جس لڑکی کی خوشی کے لئے اپنے آپ کو برباد کر دیا، رونا تو یہ ہے کہ اُسے بھی خوشی نہیں دے سکا۔ سیج سجانے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں تھے

۔آج تک لڑتی ہے اور کہتی ہے سب معاف کر دوں گی مگر یہ کبھی نہیں معاف کروں گی ۔ یہ قرض تمھیں اتارنا ہی ہوگا، مروں گی تو میرے جنازے کو خوب سجانا۔۔۔۔۔

اپنے آنسو صاف کرلو، میں تمھارے آنسو آج بھی نہیں دیکھ سکتا، سننے کے لئے ابھی بہت کچھ ہے۔تمھیں یاد ہے ناماریہ کتنا مدہم بولتی تھی، اور تمھارے مقابلے میں تو اور ہی مدہم سی لگتی تھی اور تمھارے قہقہے سن کر دور سے ہی ہانپنے لگتی تھی، اب وہی مدہم لڑکی بلند آواز سے روتی ہے اور گندی گالیاں بکتی ہے۔میں نے اسے ڈپریشن کی مریضہ بنادیا ہے۔رات کو نیند کی گولی کھاتی ہے دن کو ڈپریشن کی، پھر اس کے بعد وہ اس قابل ہوتی ہے کہ بچوں کی ذمہ داریاں پوری کرسکے۔۔تم دونوں میں ایک قدر مشترک تھی تمھاری طرح وہ بھی مجھے چراغ کا جن سمجھتی تھی جس کے پاس دنیا کے ہر مسئلے کا حل ہوگا۔صوبی! تمھاری فرمائیشیں پوری کر کر کے، تمھارے چہرے پر ہنسی بکھیر بکھیر کے میں بھی اپنے آپ کو بڑا جادوگر سمجھنے لگ گیا تھا۔ ۔مگر میں کیا نکلا؟ انسانوں کی قطار میں کھڑا ہو کر اپنے آپ کو جھوٹ کے عوض بیچنے والا غلام اور جانتی ہو کتنے ہی ان چاہے ہاتھ میری روح کو چھوتے ہیں اور میں اُف تک نہیں کرتا۔تو اس بدقسمت کی مایوسی اسی لئے اتنی گہری اور جائز ہے۔وقت سے پہلے اڑان بھرنے کے چکر میں، اپنے آپ کو ماریہ کا مضبوط سہارا بنانے کے چکر میں، میں تو مارا گیا یار۔مگر افسوس یہ کہ جس کی خاطر موت کو گلے لگایا، زندگی اس کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔۔گندے کپڑے پہنے بال بکھرائے، روزمرہ کے کام کرتے کرتے اسکی آنکھوں سے خاموش آنسو بہتے رہتے ہیں، جیسے کسی کی مستقل موت ہو چکی ہو۔"

" کاش کوئی ایسا دروازہ ہوتا جس میں میں تم دونوں کو داخل کر دیتی اور وہاں یہ سب کچھ نہ ہوتا جو تم لوگوں کے ساتھ ہوا، وہاں ڈھولک کی تھاپ پر سہیلیوں کے گیت ہوتے، تمھارے گھر والے ماریہ کو محبت سے بیاہ کر لے کر جاتے تمھاری ماں اس کے چونچلے

اٹھاتی، وہ ہنستی کھیلتی تمھارے بڑے خاندانی گھر میں داخل ہوتی اور خوشی اس کا کشادہ ماتھا چوم لیتی، اس کی سیج خوبصورت اور خوشبودار پھولوں سے سجی ہوتی۔تم اس کو جی بھر کے محبت دیتے، اس کی ہر فرمائیش پوری کرتے اور اس کی آنکھوں میں ناتمام خواہشوں کا روگ نہیں بلکہ تمھارے لئے عزت اور محبت ہوتی۔"

" سنو صوبی میں نے تمھیں کبھی ہچکیوں سے روتے نہیں دیکھا تھا، بہت پاکیزہ لگ رہی ہو، مگر میں کتنا آلودہ ہو گیا ہوں اور تم ویسے کی ویسے ہی ہو، آج بھی آنسو تمھارا چہرہ دھو دیتے ہیں، کاش تم ڈھیٹ ہو جاتی، کاش تم ہی بدل جاتی۔۔۔ہم تینوں میں سے کوئی ایک تو موت سے بچ جاتا۔"

"میں نہیں رو رہی۔۔اور تیرے لئے؟ تو کبھی بھی نہیں۔۔"

"جھوٹ بولنا کبھی نہ چھوڑنا، اتنی صدیوں بعد نہیں چھوڑا تو اب کیا چھوڑو گی۔۔۔ صوبی ایک بات مانو گی؟

بولو قیصر؟

"تم دکھی رہنا چھوڑ دو، شادی کا فیصلہ ہو گیا، شادی ہو گئی اور بچے بھی ہو گئے، اتنا کچھ ہو گیا اور اب یہ سب undone نہیں ہو سکتا۔۔بس اسی سب کے ساتھ جینا سیکھ لو۔جیسے کسی کا کوئی پیارا مر جاتا ہے تو وہ ساتھ نہیں مرتے مگر روز یاد بھی نہیں کرتے بس اس دکھ کے ساتھ جینا سیکھ لیتے ہیں تم بھی اپنی موت کے ساتھ یہی کرو اور خدا کے واسطے اپنے مردے کے ساتھ جینا سیکھ لو۔۔"

"بس۔۔میں تمھیں دُکھی نہیں دیکھنا چاہتی، ہمیشہ کی طرح اس میں بھی میرا اپنا ہی لالچ ہے، تم دکھی ہوتے ہو تو کمزور سے لگتے ہو اور میں اپنا سائبان طاقتور دیکھنا چاہتی ہوں، جس میں میرا دکھ سنبھالنے کی طاقت ہو اور وہ بس HE Man ہو۔"

"صوبی سچ پوچھو تو اب زندگی سے کچھ لینا دینا نہیں, نہ خدا سے کچھ مانگنے کو دل کرتا ہے نہ جینے کے کسی سلیقے کو سیکھنے کو دل کرتا ہے۔ اب تو بس ایک ہی خواہش باقی رہ گئی ہے کہ تمھاری ہتھیلی پر اپنا سر رکھ کے اتنا روؤں کہ سب دکھ اور یادیں اس طوفان میں بہہ جائیں ۔"

"اور قیصر میں ایک دفعہ بس تمھارے ساتھ بس ایک دفعہ، سورج نکلتے دیکھنا چاہتی ہوں اور اس کے بعد چاہے پوری دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شام ہو جائے اور کبھی کہیں کوئی سورج نہ نکلے"

"اور صوبی میں تمھارے ساتھ مل کر اپنے دکھ پر، تمھارے دکھ پر اور ہمارے دکھ پر رونا چاہتا ہوں، بس ایک دفعہ اور پھر چاہے میری زندگی کی شام ہو جائے۔"

" قیصر! دیکھو سب ختم ہو گیا مگر اس کے باوجود ہماری خواہشوں کی موت نہیں ہوئی۔۔"

جھوٹے وعدوں کی کرچیاں

زرق برق لباس پہنے عورتیں اور قیمتی سوٹوں میں ملبوس آدمی، ادھر اُدھر بھاگتے دوڑتے بچّے، ان سب سے ہال بھرا ہوا تھا۔ کینیڈا میں بھی پاکستانی انداز میں اعلی طبقے کا ایک روایتی سا فنکشن ہو رہا تھا۔ اور حسبِ معمول میں، وہاں اپنے آپ کو مس فٹ محسوس کر رہی تھی۔ ہماری میز پر خاموشی کا راج تھا۔ جیسے کسی بھی ایسی جگہ پر اجنبی لوگوں کی آپس میں گفتگو کے آغاز سے پہلے ہوتا ہے، سب لوگ ایک دوسرے کے کپڑوں کا، بالوں کے سٹائل کا، اٹھنے بیٹھنے کا خاموش جائزہ لیتے ہیں اور پھر دل ہی دل میں کچھ جانچ کر بات شروع کرتے ہیں یا پھر خاموش رہنے کا ہی فیصلہ کرتے ہیں۔

ہماری میز کی خاموشی کو سٹیج پر شروع ہونے والی تقریروں کے سلسلے نے توڑ دیا، خاموشی تو ٹوٹ گئی مگر اب تقریروں کی بوریت کی وجہ سے جمائیوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔۔ ایک آدھ مقرر کی بات لوگوں کے دل میں اتری بھی مگر بور کرنے والوں کی اکثریت زیادہ تھی۔

اللہ اللہ کر کے کھانے کے لئے اعلان ہوا تو سب لوگوں کی زندگی کو مقصد مل گیا۔ مجھے اس سجے سجائے ہال میں پہلی بار خوشی کی لہر محسوس ہوئی۔ میرا پیٹ بھی بھوک کی اذان دے رہا تھا اسلئے کھانے کی نماز شکر کر کے ادا کی۔ کھانا پیٹ بھر کے کھا چکنے کے بعد اب آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں تو میں اس بھاری بھر کم فنکشن سے نکلنے کا سوچنے لگی،

ابھی اٹھنے کا ارداہ باندھ ہی رہی تھی کہ سٹیج سے گانوں کا شور اٹھا۔یعنی تقریروں والی محفل اب گیت سنگیت میں تبدیل ہو چکی تھی۔مگر میوزک عورتوں کے زرق برق لباس کے عین مطابق خوب شور شرابے والا تھا۔

پھر اچانک میں نے محسوس کیا لوگ گلوکار کی طرف دیکھنے کی بجائے کہیں اور دیکھ رہے ہیں اور اکتائے ہوئے چہروں پر ایک بشاشت چمک رہی ہے۔ ہیں؟؟؟ ان سب مُردوں میں کیسے جان پڑ گئی،ان کی آنکھوں کی سمت دیکھا تو ایک ننھی سی تین یا چار سال کی گڑیا،خوبصورت شوخ رنگوں کی شلوار قمیض پہنے دنیا جہاں سے بے خبر میوزک کے ساتھ مست ڈانس کر رہی تھی۔اس کے انداز میں اتنی بے ساختگی اور کشش تھی کہ تقریباً سارے ہال کی آنکھیں اس ناچتی گاتی پری پر لگی ہوئی تھیں،مگر میں تو اس کو دیکھتے ہی کسی اور دنیا میں کھو گئی اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "اس بچی کو دیکھ کر میری تو اس فنکشن میں آنے کی کوفت ہی ختم ہو گئی ہے۔"

"اب ایسی بھی بات نہیں مٹن چاپس بھی بہت اچھی تھیں۔۔" ساتھ بیٹھی خاتون نے لقمہ دیا۔

میں نے فنکاری سے اس بے تکی بات کو نظر انداز کیا اور وقت ضائع کئے بغیر خاموشی سے اپنی نگاہیں اس بچی پر کچھ اس طرح ٹکا دیں کہ ہال کے باقی مناظر میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہی ہو گئے۔اب میں تھی اور اس بچی کا دور سے روشنی دیتا ہوا چہرہ۔

تیز موسیقی ذہن کو متحرک کرے نہ کرے جسم کو کچھ نہ کچھ تحریک دے ہی دیتی ہے اسی لئے اب کئی جوڑے سٹیج کے پاس پہنچ کر ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے رقص کر رہے تھے۔مگر اس بچی کے جوش میں رتی برابر کمی نہیں آئی تھی۔اسی اعتماد کے ساتھ وہ سٹیج کی رونق بنی رہی۔اور میرے دل کو ایک خواہش عجیب سے طریقے سے جکڑنے لگی کہ کسی

طرح اس بچی کو گود میں اٹھا لوں۔اور اس کی گالوں پر چٹاخ پٹاخ بوسے دوں۔

وہ بچی انتہائی خاموشی سے میری انگلی تھامے مجھے ماضی کی گلی میں لے گئی تھی،جہاں میری گڑیا سارہ فراک پہنے کھڑی تھی اور ایسے ہی بے نیازی سے وہ میرے ساتھ چھلانگیں لگا رہی تھی،ہم دونوں بارش میں ڈانس کر رہی تھیں اور وہ میری لمبی قمیض میں گھس کر کہہ رہی تھی "اب مجھے پورے گھر کی سیر کراؤ۔" سارہ کی آواز میرے کانوں میں اتنی صاف سنائی دینے لگی کہ میں بھول ہی گئی کہ میں بہت سال آگے کو نکل آئی ہوں اور وہ مجھ سے بہت دور رہ گئی ہے۔اب مجھے یاد آ رہا تھا کہ میں کالج سے جتنی بھی تھکی ہاری آتی تھی اسے دیکھ کر سب تھکاوٹ بھاگ جاتی تھی۔سالوں پہلے والی وہی "تھکاوٹ بھاگ جانے والی کیفیت" اس اجنبی بچی کو دیکھ کر محسوس ہوئی۔پتہ نہیں کون ہے وہ بچی جو سارہ کا دوسرا روپ لگ رہی ہے۔

سارہ تو اب ایک نوجوان لڑکی ہے،مگر جب میں پہلی دفعہ اسے چھوڑ کر ایک مہینے کے لئے بڑی بہن کے پاس دبئی گئی تھی تو وہ بھی اتنی ہی سی تھی،تین چار سال کی۔تب وہ میرے بغیر ایک مہینہ بھی نہیں رہ سکی تھی اور سخت بیمار پڑ گئی تھی۔اس ہال میں بیٹھ کر مجھے وہ چھوٹی سی سارہ نظر آ رہی تھی جسے میرے بہنوئی نے کمبل میں لپیٹ کر اٹھایا ہوا تھا۔ایئر پورٹ سے باہر نکلتے ہی اس کے بخار میں تپتے چہرے کو دیکھا تو میری چیخیں نکل گئیں۔اور میری بہن یعنی سارہ کی ماں،مجھے دیکھتے ہی غصے سے بولی تھی۔۔

" تو نے کیا میری بیٹی کو پیچھے لگایا ہوا ہے"؟ خود تو سیر سپاٹوں پر نکل گئی پیچھے یہ بیمار پڑ گئی"۔

میں نے جیسے اس کی ڈانٹ سنی ہی نہ ہو اور بے تابی سے اپنی سارہ کو گود میں بھر لیا تھا اور اسے کہا :"دیکھ میں تیرے لیے سونے کی بالیاں اور چاکلیٹ لائی ہوں" وہ کھلکھلا

کرہنس پڑی اور ساتھ ہی کسی کی آواز کانوں میں پڑی:

"لواتنی سی کوسونے کی بالیاں ,اپنے جہیز کے لئے کچھ لے آنا تھا۔".

"جہیز؟ میں نے کون سی شادی کرنی ہے، میں نے تو بس اپنی سارہ کے پاس ہی رہنا ہے۔۔سارہ اورزور سے میرے ساتھ چمٹ گئی اور ،بہن اور غصے سے بولی" دیکھا پھر میری گُڑی کو پاگل بنا رہی ہے۔"

سارہ کو پاس رکھنے کے لئے میری اور بہن کی لڑائی ہوتی رہتی تھی۔سارہ جب بھی میرے پاس آتی مَیں دنیا جہاں بھول کے اس کی ذات میں گم ہوجاتی ،ہم اس کی ماں کی ڈانٹ کے باوجود بارش میں بھیگنے چلی جاتیں اور سارہ کے چہرے پر مسکان لانے کے لئے میں کچھ بھی کرتی اور اس کو اسکی ماں کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچانے کے لیئے جان پر کھیل جاتی۔ میری بہن غصے کی بہت تیز تھی۔سارہ کے پیدا ہونے سے پہلے میں اس کا سامنا کرنے سے بھی بچتی تھی مگر سارہ کے پیدا ہونے کے بعد اسے ماں کے غیض وغضب سے بچانے کے لئے اب میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہوجاتی تھی۔ مجھے سارہ کے چہرے پر بس خوشی دیکھنا ہوتی تھی۔مگر میں شادی نہ کرنے اور ہمیشہ اس کے پاس رہنے کا وعدہ نہ نبھا سکی اور پھر اپنی نئی زندگی میں مصروف ہوکر دیکھ ہی نہ پائی کہ میری سارہ کے اندر کیا چلتا رہا تھا اور میرے بغیر جینے کی عادت ڈالنے کے لئے اس نے خود سے اور مجھ سے کیا کیا جھوٹ نہیں بولے تھے۔۔۔

"یہ بچی کون ہے؟" سٹیج پر ناچتی جھومتی بچی جو مجھے ماضی میں لے گئی تھی ،حال میں بھی لے آئی۔ پتہ نہیں کیوں ،مگر دل سے دعا نکلی کاش اس بچی کو کبھی کوئی چھوڑ کے نہ جائے، جیسے میں نے سارہ کو چھوڑ دیا تھا۔کاش اس کے چہرے پر خوشیوں کی دھنک یوں ہی بکھری رہے۔

سارہ پیچھے ماضی میں کھڑی اداس اور بے یقین نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں لاہور ائیر پورٹ سے اپنے شوہر اور دو ننھے ننھے بچوں کو سینے سے چمٹائے اس سے نظریں ملائے بغیر اسے چھوڑ کے،اپنے نئے گھر کینیڈا جا رہی تھی۔میں نے ایک دفعہ ڈرتے ڈرتے پیچھے مڑ کر اسے دیکھا اور اسی لمحے میرا وقت وہیں پتھر کا ہو گیا تھا۔سارہ میری نظروں میں وہی چھ سال کی بچی کی صورت جم گئی تھی اسی لئے چودہ سال پرانے وقت سے نکل کر، اسی قد کاٹھ کے ساتھ ،اسی چہرے کے ساتھ آج میرے سامنے ناچتی ہوئی گول گول گھوم رہی تھی۔

یادوں نے اور اپنی وعدہ خلافی نے دل درد سے بھر دیا اور آنکھیں چھلکنے ہی والی تھیں کہ اپنی میز کے باقی لوگوں سے آنکھیں چُرا کر اس ہال سے باہر نکل گئی ۔۔ وہاں کھڑے نہ جانے کتنے سال بیت گئے کہ اچانک کوئی میری ٹانگوں سے آکر لپٹ گیا" آنٹی مجھے شوز پہنا دیں" ۔۔سارہ!! ایک دم میرے اندر کوئی زور سے چیخا۔اس کے گول گول گدگدے ہاتھوں میں چھوٹی سی سینڈل پکڑی ہوئی تھی اور وہ اسے میری طرف بڑھا رہی تھی، میں دھندلائی آنکھوں کے ساتھ فوراً جھک کر اسے جوتے پہنانے لگی،ساتھ ہی ایک مردانہ آواز میرے قریب گونجی:

"یہ ہماری بڑی منتوں مرادوں والی بیٹی ،اقراء ہے" میں چونک گئی" اوہ تو یہ سارہ نہیں، یہ تو سٹیج والی ڈانسنگ ڈول ہے۔" آپ پلیز اسے شوز نہ پہنائیں"،وہ شائد اس ڈانسنگ ڈول کے ابو تھے جن کی جیبوں سے ننگے پاؤں بھاگتی دوڑتی اقراء نے اپنے سینڈل نکال کر میرے حوالے کئے تھے۔

"اچھا اب پتہ چلا آپ کی تقریر اتنی اچھی کیوں تھی، کیونکہ جیب میں اقرا کے جوتے برکت کے لئے ڈالے ہوئے تھے؟ میں نے ہنستے ہوئے اقرا کے ابو کی تقریر کی

تعریف کی اور اقرا نے اپنے امی ابو کے منع کرنے کے باوجود جوتے مجھ سے ہی پہنوائے ۔

یہ تھی چودہ سال پہلے بچھڑنے والی سارہ سے میری کینیڈا میں پہلی ملاقات ۔ وہی چمکتی ذہین آنکھیں، ننھی منی ناک، گلابی ہونٹ، وہی باتیں وہی شرارتیں اور سب سے بڑھ کر میرے ساتھ چمٹنے کا وہی انداز ۔ اب کی بار سارہ سے دور نہیں ہونگی ۔ میں نے دل ہی دل میں میرے کینیڈا آنے کے بعد سارہ کی مستقل شکایت کو سوچا " میرا بچپن تیرے بغیر ہی گذر گیا ہے" ۔

کیا وہ کھویا ہوا بچپن میرے سامنے دوبارہ جینے کو آ گیا ہے ۔ میں قدرت کے اس کرشمے پر حیران تھی ۔ کیا یہ مجھ پر قدرت کی کچھ خاص مہربانی ہے یا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس "یا" کا معمہ بعد میں کھل گیا۔ مجھے اس بچی میں کشش محسوس ہو تو ہو مگر حیران کن بات یہ تھی کہ وہ بچی بھی اسی شدت سے میری طرف مائل تھی ۔ کیا یہ اس" یا" کا کمال تھا؟ جس کے جواب کے لئے مجھے چودہ سال انتظار نہیں کرنا پڑا۔

اقرا کی اور میری کہانی سے پہلے سارہ کی اور میری کہانی کی یادوں کے کرب سے ابھی اور گذرنا پڑے گا۔ ہمیں کینیڈا آئے ابھی تین مہینے ہی ہوئے تھے کہ ہمارے پورے خاندان پر یہ خبر قیامت بن کر ٹوٹی کہ ننھی سارہ کی ماں کو دماغ کا کینسر ہے، پیروں تلے سے زمین نکل گئی، سر سے آسمان کھسک گیا تھا۔ کھانا، پینا، سونا حتیٰ کہ جینا بوجھ لگنے لگ گیا تھا۔ زندگی ایسی بے مقصد اور ویران لگنے لگی کہ میرے شوہر نے میری حالت دیکھ کر مجھے پاکستان واپس بہن کے پاس بھیج دیا۔ تین مہینوں بعد ہی مجھے اپنے سامنے پا کر سارہ کی خوشی دیدنی تھی ، ماں کی بیماری کی شدت کی اس معصوم جان کو کوئی خبر نہیں تھی ۔ اسے تو میں مل گئی ۔ مگر میں اندر سے سہمی پڑی تھی ۔

بہن سے روتے روتے کہا " میں سارہ کو اپنے ساتھ رکھنے پر اب کبھی تم سے لڑائی

نہیں کروں گی، تمھاری قسم میں اسے ایک دن بھی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتی ۔"

"ہاہائے ۔۔۔تم لوگوں میں نجانے کتنا پیار تھا کہ میرا ہی درمیان سے کانٹا صاف ہو جائے گا ۔۔ بہن نے روتی آنکھوں میں زبردستی کی مسکراہٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"تمھارے مقابلے میں میرا سارہ کے لئے پیار ایک پائی کا بھی نہیں , تم ہی تو کہتی ہو میں اسے بگاڑتی ہوں، دیکھو میں اسے بگاڑ دوں گی ، دیکھو! مجھ پر اعتبار نہ کرنا ۔۔" میں نے دھمکی دی۔ مگر اس نے میری کسی بات کا یقین نہ کیا۔ پچھلے دو تین سالوں سے ہر دسمبر میں اس کی حالت بگڑ جاتی تھی ۔ میں ہر دفعہ سوچتی کچھ ہو گیا تو سارہ کے پاس کیسے پہنچ پاؤں گی؟ اتنی دور سے اسے کیسے سہارا دے پاؤں گی؟

پھر ایک منحوس دسمبر آیا اور میں حسبِ معمول پاکستان چلی گئی ، بہن بے حس و حرکت پڑی تھی ۔ اس کا پورا جسم مفلوج ہو چکا تھا مگر شائد اس دن 14 دسمبر کو اس کا صرف دل کام کر رہا تھا ، میں صبح کے چار بجے پاکستان پہنچی تھی ۔ بہن کو اس حال میں دیکھ کر اللہ سے بہت دعا کی کاش وہ ایک دفعہ آنکھ کھول دے اور مجھے دیکھ لے کوئی ایک انگلی کی حرکت سے مجھے دل کی کوئی بات بتا دے ۔ مگر اس نے نہ کچھ کہا ، نہ آنکھیں کھولیں بس شائد کمرے میں میری موجودگی کو محسوس کیا اور سارہ کو میرے حوالے کر کے دنیا سے منہ موڑ گئی ۔ میں سارہ کے پاس اس کی زندگی کے سب سے کٹھن مرحلے میں پہنچ چکی تھی اور اس کی ماں اس یقین کے ساتھ چلی گئی تھی کہ میں اسے اس کڑے وقت میں سنبھال لوں گی اسی لئے اس نے اسی دن شام چار بجے اس دنیا کو الوادع کہہ دیا تھا۔

اور جب سفید کفن اور لال دوپٹے میں لپٹی بہن کو چار آدمی کاندھوں پر اٹھائے نعرہ تکبیر کہتے لے گئے تو میں اس کے پیچھے بھاگی تھی ، میں نے چیخ چیخ کر اسے بتانا چاہا کہ" خدا کے واسطے میرے ساتھ یہ ظلم نہ کرو ، میں سارہ کو نہیں سنبھال سکتی ، ایک دن بھی نہیں ۔۔ خدا

کی قسم رک جاؤ۔۔" مگر میری چیخ ابکائی کی صورت نکل گئی اور اس تک کوئی آواز نہ گئی۔اور وہ انتہائی اعتماد سے اپنی بیٹی سے پیار کرنے کی سزا مجھے سنا کر چلی گئی، "لو سنبھالو اسے" ۔لگتا تھا ہر طرف بین ڈالتی عورتیں یہی کہہ رہی ہیں" سنبھالو سارہ کو" میں نے بے بسی سے سارہ کو ساتھ لگایا وہ برف کا تودہ بنی کھڑی تھی، ہم جو اکٹھے ساتھ رہنے کے لئے اس کی ماں سے جھگڑا کرتی تھیں، اب ایک دوسرے کو تھامے ایک دوسرے کو محسوس کرنے کی طاقت بھی کھو چکی تھیں۔

آج فنکشن سے گھر آتے ہی سارہ کو اقراء کے بارے بڑے جوش وخروش سے بتایا" سارہ بالکل تیری طرح مجھے چمٹ گئی"۔۔

"اچھا خالہ۔۔بُجھی بُجھی سی آواز۔۔او!! میں چونکی، بہن کے جانے کے بعد ایک احساسِ جرم مجھے ہمیشہ گھیرے رکھتا تھا، میں اپنے بچوں کے ساتھ ہوں بہن ٹھیک کہتی تھی میں اس کی کُڑی کو پاگل بنا رہی تھی۔

"بس خالہ اب اسے بھی نہ ساتھ چمٹا لینا۔۔سارہ کا میرے لیئے احساسِ ملکیت بولا ۔۔

"نہیں نہیں کیوں چمٹانا ہے؟ وہ کون سا خون کا رشتہ ہے؟"

"تمھارے والی بات تو نہیں نا۔" میں خوامخواہ اپنا دفاع کرنے لگ گئی، تم تو میری اپنی بہن کی بیٹی تھی، اور جب تو دنیا میں آئی تو میری شادی نہیں ہوئی ہوئی تھی، میرے پاس کون سا کوئی بچہ تھا۔اور تو نے مجھے میرے اپنے بچوں سے بھی پہلے ماں بنایا تھا اور اب تو میرے اپنے بچے، میرا بچونگوڑوں سے دل بھر گیا ہے۔"

پتہ نہیں یہ سب میں سارہ سے کہہ رہی تھی یا خود کو سمجھا رہی تھی یا اس بچی سے اپنے آپ کو دور رہنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

مگر ہوا یوں کہ میں اس بچی سے اپنے آپ کو دور نہ رکھ سکی۔اور سارہ کے ساتھ کیا گیا ایک اور وعدہ توڑ دیا۔وہ بچی جہاں بھی ملتی مجھے اس کے اندر ایک بے نام سی کشش محسوس ہوتی۔وہ بھی سب ہجوم کو چھوڑ کر میرا ہاتھ تھام لیتی، میری گود میں چڑھنے کی ضد کرنے لگتی۔ اس کی امی کی آنکھوں میں مجھے اپنے لئے ایک کھنچاؤ سا محسوس ہونے لگا۔بالکل ویسا ہی جیسا میری بہن کی آنکھوں میں اس وقت آتا تھا جب سارہ میرے پیچھے پیچھے بھاگتی تھی۔سارہ کی ماں میری اپنی بہن تھی میں اس سے ضد کر کے، لڑائی کر کے سارہ کو پاس رکھ لیتی تھی۔ اقرا کی ماں، ایک تو بہن نہیں تھی دوسرا بہن کے ساتھ ضد کرنے کی بہت بڑی سزا بھگت چکی تھی۔یہ کوئی گڑیاؤں کا کھیل نہیں تھا۔یہ زندگی تھی اور یہ بچیاں جیتی جاگتی لڑکیاں ہیں میری گڑیاں نہیں ہیں۔وہ لڑکیاں جنہیں بس اپنی ماؤں کے پاس ہی رہنا چاہیئے۔اور جن کی ماؤں کو ان کے پاس ہی رہنا چاہیئے۔میں محتاط رہنے کی کوشش کرتی، مگر اقرا کی پانچ سالہ زندگی میں کوئی ایسا کڑوا تجربہ نہیں تھا۔وہ تو بس دل کی بات پر ڈانس کرتی میری طرف بڑھتی رہی۔

"آنٹی میں تو بس احمد سے ہی شادی کروں گی۔میرے بیٹے کے ساتھ کھیلتے کھیلتے وہ دل کی خواہش نہ صرف مجھے بلکہ اپنے ماں باپ کو بھی بتا دیتی۔۔اور ہم سب اسکی سادگی پر ہنس پڑتے۔میرا بیٹا احمد جو اقراء سے عمر میں ایک سال بڑا تھا، شرما کر رہ جاتا۔اب کیسے اقرا سے دور ہوں اب تو ماں باپ بھی دوست بن گئے اور بچے آپس میں دو جسم ایک قلب بن کر گھوم رہے ہیں، میری احتیاط دھری کی دھری رہ گئی۔۔ابھی میں اسے ساتھ چمٹانے سے بچ رہی تھی کہ" یا" درمیان میں آ گیا۔۔۔۔ایک دفعہ پھر زمین آسمان ہل گئے۔" اقراء کی امی کو جگر کا کینسر ہو گیا ہے"۔یہ خبر نہ تھی ایک بم تھا جو سماعت پر پھٹا۔

"یہ تو برین ٹیومر کی طرح خطرناک نہیں ہوتا؟ اس کا تو علاج ہوتا ہوگا، اچھا نہیں بھی

ہوتا ہوگا تو اقراء کے جوان ہونے تک تو بہت سال مل جائیں گے نا، جیسے میری بہن کو سارہ کے جوان ہونے تک مل گئے تھے؟"

میرے ان تمام سوالوں کے جواب منفی میں نکلنے لگے اور خوف میرے معدے میں آکر ٹھہر سا گیا۔سوچا اقراء سے دور بھاگ جاؤں، تقدیر سے بھڑ جاؤں مگر اقراء سارہ کی طرح محبت میں پرعزم بھاگ بھاگ کے میرے پاس آنے لگ گئی دوسری طرف اس کی امی کی آنکھوں میں بھی ایک کھو دینے کا کرب نظر آنے لگ گیا۔ وہ بہن کی طرح منہ سے نہ کہتی تھی مگر جب اقرا بھاگ کر میری طرف آتی یا میرے ساتھ کھڑی ہوتی اور ماں بلاتی تو وہ نہ جاتی، تو اسکی آنکھیں کہتی نظر آتیں۔۔

"میری بیٹی کو چھین لیا مجھ سے" اور میں عادی چوروں کی طرح اس کی آنکھیں دیکھتے ہی اپنی صفائیاں دینے لگ جاتی۔

"ماں کے علاوہ بچے کسی کے نہیں ہوتے۔۔ماں کے علاوہ کوئی بچوں کو نہیں سنبھال سکتا"۔اور میرے اندر میرا پرانا خوف چیخنے لگتا اور دل کرتا اس خوف کو زبان دے دوں اس کو کہوں" بی بی! کان کھول کے سن لو، خبردار! جو مرنے کا سوچا بھی تو"۔

مگر میرا حلق پہلے ہی خشک ہو جاتا اور باقی کے رسمی دفاعی الفاظ بھی ساتھ چھوڑ دیتے تھے اور میں بس سوچتی ان ماں بیٹی سے کہیں دور بھاگ جاؤں۔مگر کوئی مجھے بھاگنے بھی تو دے۔۔

" آپ اسے کیمو میں ساتھ لے کر نہ جایا کریں، اس کا کیا قصور ہے اس عمر میں یہ بیماری دیکھے، ہسپتال دیکھے۔۔ میں ساری احتیاط کے باوجود، اقراء سے دور بھاگنے کی خواہش کے باوجود، ایک دفعہ پھر سے اپنا پرانا انجام بھول کر، سارہ کا بچپن بچانے، اسے خوشیوں سے بھرنے کے لئے، اس کے چہرے پر خوشی کی دھنک بکھیرنے کے لئے، اسی کی

ماں کے ساتھ ضد لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"نہیں یہ میرے ساتھ ہی رہے، سب کچھ دیکھے۔" اقراء کی ماں کے لہجے میں ممتا بولتی جو جانتی ہے کہ ہسپتال میں بچی کو ساتھ لے جانا ٹھیک نہیں مگر جو خود غرض بھی ہوتی ہے کہ میری بیٹی میرے پاس زیادہ سے زیادہ رہے۔اقراء کی ماں میری سگی بہن نہیں تھی اس سے لڑائی نہ کر سکتی تھی، خاموش ہو جاتی۔مگر پھر اقراء کسی نہ کسی طرح مجھ تک پہنچ ہی جاتی تھی۔اور آتے ہی سارہ کی آواز میں بولتی:

"دیکھو میں پھر آ گئی۔۔"

میں کشمکش میں پڑ جاتی"اس سے دور بھاگوں یا اس کی طرف بھاگوں؟"

پھر فیصلہ اس کی طرف بھاگنے میں ہی ہوتا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے کام مجھے باندھ لیتے اور اس کی مسکراہٹ کی خاطر اس کی ماں کی شکایت بھری نظروں کو نظر انداز کرنے کی ہمت آ جاتی۔مگر اس کے باوجود روز ایک سوال میرے سامنے آ کھڑا ہوتا۔

" کیا اقراء کی ماں جگر کے کینسر سے بچ جائے گی؟"

"ہاں اسے بچنا ہی ہوگا , اس دفعہ کوئی میرے بھروسے اپنی بچی چھوڑ کر میری آنکھوں کے سامنے یوں دھڑلے سے نہیں جائے گا,میں صاف انکار کر دوں گی، میں صاف انکار کر رہی ہوں۔اپنی بچیاں سنبھال کے رکھو، مجھے کسی کی بچی سے کوئی پیار نہیں۔کوئی میری ٹانگوں سے آ کر نہ لپٹے، اپنی اپنی بچیوں کو خود ہی جوتیاں پہناؤ، ان کے کام کرو، ان کے ساتھ کھیلو۔۔خدا کے واسطے مجھے شکایت بھری نظروں سے نہ دیکھو۔میرا یقین کرو کوئی مائی کا لال دنیا میں کسی ماں کی جگہ نہیں لے سکتا۔کوئی کسی کے بچے کو نہیں پال سکتا۔۔یقین کرو میرا۔مجھ پر شک نہ کرو کہ میں تمھاری بیٹیاں چھین رہی ہوں۔۔سنبھالو اپنی بیٹیوں کو۔۔۔'

میں چلاتی رہ گئی۔مگر سارہ کی ماں کی طرح اقراء کی ماں نے بھی میری ایک نہ

سنی۔۔۔

میں اس گمان میں تھی کہ اقراء کی ماں کے پاس ابھی کچھ سال تو ہیں اور یہ کینیڈا ہے۔ اچھے سے اچھا علاج ہوگا۔ سارہ کی ماں تو پاکستان میں تھی، وہاں اتنی سہولتیں نہیں ہیں اسلئے یہاں کچھ نہیں ہوگا مگر سب خوش فہمیاں دھری کی دھری رہ گئیں اور ایک دن دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو اقراء کے ابو اسے ہاتھوں میں اٹھائے میرے در پر سر جھکائے کھڑے تھے، میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا، ان کے بولنے سے پہلے ہی میری نظر گاڑی میں بیٹھی نڈھال، موت کے بالکل قریب، اقراء کی امی پر پڑی۔ وہ آنکھیں جن میں میرے لئے خاموش شکایتوں کا ایک کرب نظر آتا رہتا تھا آج اعتماد سے بھری ایک بھیک تھی، خاموش شکایت کی طرح خاموش بھیک۔۔ میری بیٹی کو سنبھال لینا۔۔۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا" طبیعت کیسی ہے؟"

خاموش آواز سے بولی۔"نہیں ٹھیک، بہت درد ہو رہا ہے"۔ اور آنکھوں میں ایسی تھکاوٹ تھی جیسے کوئی بہت دور سے مسافت طے کر کے آیا ہو یا کوئی لمبی جنگ کے بعد ہتھیار ڈال دے۔ اب ایک دفعہ پھر سے مجھ میں ہتھیار ڈالی آنکھیں دیکھنے کی سکت نہیں تھی۔

آنے والے وقت کے خوف سے میرا اندر کانپنے لگا، دل کیا اسی وقت ان کی بیٹی ان کو واپس کر دوں اور کھری کھری سناؤں" لے جاؤ اپنی بیٹی کو میں نہیں سنبھال سکتی، کیا لگتی ہوں میں تمھاری؟ کیا لگتی ہے یہ میری؟ میں تو تمھاری بیٹی کو چھین رہی تھی نا خدا کے واسطے اس خوف کو مت جھٹلاؤ، وہ سچا خوف تھا۔۔ مجھ پر اتنا اعتماد نہ کرو۔۔ خدا کے واسطے اپنی بیٹی کو لے جاؤ۔۔ کوئی بھلا ایسے بھی اپنی بیٹی کسی کے حوالے کر کے جاتا ہے۔ میرا اس سے کوئی خون کا رشتہ نہیں۔۔ سن لو میری بات۔۔ مت جاؤ اپنی بیٹی کو چھوڑ کے، مت جاؤ"۔

مگر وہ بیٹی کو میرے حوالے کرتے ہی یوں اطمینان سے ہسپتال کی طرف چلی گئی جیسے اب اس کو کوئی درد نہیں ہو رہا۔

اور اقرا خوشی سے میری ٹانگوں سے چمٹی نہیں جانتی کہ اس ننھی سی عمر میں وہ کتنے بڑے حادثے سے دوچار ہونے والی ہے۔ ماں بھی مطمئن ہو کے چلی گئی، بیٹی بھی خوش ہے۔ اور میرے پاس اب اس کے علاوہ سوچنے کے لئے کوئی اور چارہ نہیں کہ اقرا کے چہرے کی خوشی کو یہیں پر (preserve) حنوط کرلوں۔ مگر ایک دو دن بعد ہی اقرا کے ابو کا فون آ گیا،

" آپ اقرا کو ہسپتال لے آئیں تا کہ وہ اپنی امی سے مل لے۔"

"ہسپتال آنا ضروری ہے؟" میں ابھی بھی اقرا کو بیماری کی بدصورتی اور ظلم سے بچانا چاہ رہی تھی۔۔

"ہاں جی، شائد یہ آخری ملاقات ہو!! ابو کا دکھ میں ڈوبا دوٹوک جواب آیا اور میں شکست کھائے جواری کی طرح اقراء کو لے کر ہسپتال پہنچ گئی۔ اقرا کے چہرے پر خوشی کے رنگ بسائے رکھنے کا جوا، جس کے لئے میں نے اپنی ذاتی زندگی، بچے، شوہر، معاشرہ اور لوگوں کی باتیں سب کو داؤ پر لگایا ہوا تھا، وہ جوا میں ہار چکی تھی۔

اور سارہ کی ماں ایک دفعہ پھر میرے سامنے آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ نقاہت اتنی کہ آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ اقرا کی امی اسے میرے ساتھ چمٹتے دیکھ کر پھر سے مجھ سے ناراض نہ ہو جائے یا بہت زیادہ مطمئن نہ ہو جائے انہی سوچوں میں گم میں پردے کے پیچھے چھپی کھڑی تھی۔ اقراء کو کہا جا رہا تھا امی کا منہ چومو، وہ بیماری کے ہاتھوں شکست کھائی ماں کا چہرہ دیکھ کر خوفزدہ تھی۔۔

اس نے کہا" نہیں چوموں گی"، پھر میری طرف مڑ کر بولی" آنٹی آپ چومیں۔۔"

کاش مجھے اقراء اور سارہ کو انکار کرنا آتا ہوتا۔۔مگر نہیں، اسی لئے میں نے بڑھ کر اس کی ماں کی گال پر بوسہ دیا۔ بند آنکھوں کے پیچھے سے شائد اس نے مجھے اور میرے بوسے کو محسوس کیا۔اور مجھ سے پوچھا،

"اقرا ٹھیک ہے؟

ہاں بہت ٹھیک ہے تم فکر نہ کرو۔۔"اب سوچتی ہوں یہ رسمی تسلی بھی دینے کی کیا تک تھی، مجھے تب ہی کہنا چاہیئے تھا؛

"مجھ پر اعتبار نہ کرنا میں تو تمھاری بیٹی کو چھین لوں گی، اتنی قیمتی بیٹیاں پیدا کر کے۔ ان کو ایسے پیار سے پال کے کہ کسی اور کا سایہ بھی نہ پڑے اب ایسے کیسے تم اتنی لا پرواہی سے اسے دنیا میں تنہا چھوڑ کر جا سکتی ہو؟ کہاں گیا تمھارا اپنی اکلوتی مہنگی بیٹی کے لئے possession، مت کرو ایسے۔۔" مجھے اسے کھری کھری سنانی چاہیئے تھی، ایسا کرتی تو شائد وہ رُک جاتی۔

مگر 13 ستمبر کو اسی طرح، شام 4 بجے سارہ کی ماں دوبارہ میرے ہاتھ میں پانچ سال کی سارہ کا ہاتھ تھما کر اطمینان سے دنیا کو الوادع کہہ گئی۔

اور میں ایک دفعہ پھر سے ہکا بکا ایک اور ماں کو خاموشی اور بے بسی سے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

ہم سوچ ہی رہے تھے کہ اقراء کو کیسے سنبھالیں، ہمیں اس کی آوازیں سنائی دینے لگیں کبھی وہ اپنی سکول ٹیچر کو میرا تعارف کرواتے ہوئے کہتی تھی" یہ میری ماما ہے"، اور کبھی سوئمنگ انسٹرکٹر کو بتاتی تھی،

"یہ میری آنٹی نہیں ماما ہے"۔

احمد کو بھی اب دلہا نہیں اپنا بھائی کہنے لگ گئی تھی۔ کیونکہ اسے پتہ ہے جب ماں

ایک ہوتی ہے تو سب بچے بہن بھائی ہوتے ہیں۔۔اس کی ٹیچر نے بتایا کہ یہ اپنی پیدائش کی سٹوری بتاتی ہے کہ میں روبینہ ماما کے پیٹ میں تھی، پھر عظمیٰ ماما نے مجھے ان سے ادھار لے لیا اور اب میں دوبارہ اپنی اصلی ماما کے پاس آ گئی ہوں۔

وہ اس جھوٹ میں اتنا حقیقت کا رنگ بھر چکی تھی کہ مجھ سمیت سب کو یہی سچ لگنے لگ گیا تھا۔اور ہم سب یہ سمجھ کر مطمئن تھے کہ اقرا حالات سے سمجھوتہ کر چکی ہے۔

وہ ماں کے نہ ہونے کو ایک عیب سمجھ کر چھپاتی تھی۔اس کے ابو کو کوئی بھی فنکشن اٹینڈ کرنا ہوتا تھا میں اقرا کی خاطر ساتھ جاتی، احمد کو بھی ساتھ لے کے نہیں جاتی کہ وہاں اقراء کو ایک پوری ماں جو صرف اسے توجہ دے، چاہیئے ہوتی تھی۔ وہاں وہ دوسرے بچوں کو دکھانے کے لئے میری گود میں آ کر چھپ جاتی تھی۔ جان جان کر اپنی ننھی منی سہیلیوں کو میرے پاس لاتی تھی اور مجھ سے ان کی شکایتیں لگاتی تھی اور پھر اعتماد سے مجھے دیکھتی تھی جیسے میں اس کو سب مسئلوں سے نکال لوں گی اور میں دنیا کی وہ واحد ہستی ہوں جو اس کی ماں ہے، اور اس کے اوپر کوئی گرم ہوا نہیں پڑنے دوں گی۔ جو اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑے گی۔۔

ایک دن میرے ساتھ بیٹھ کر ستارے دیکھ رہی تھی۔ ہم ستاروں میں اس کی ماں ڈھونڈ رہے تھے اور میں اسے بچی سمجھ کر بہلا رہی تھی اور اس نے مجھے بڑے اعتماد سے کہا "بس آپ میری ماما ہیں۔مگر آپ نے کبھی مرنا نہیں"۔۔میں حیرت سے گنگ اسے دیکھتی رہ گئی اور کانپ گئی تھی کہ میرا تو وعدے نبھانے کا ریکارڈ بہت گندا ہے۔۔مگر پھر بھی میں نے اسے تسلی دی، اس کے چہرے پر وقتی خوشی کے رنگ بکھیرنے کو بڑے عزم سے کہا۔۔"اقرا میں تمھیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔۔تم میری بیٹی ہو، میرے پیٹ سے نکلی ہو، کوئی ہمیں الگ نہیں کر سکتا۔۔"

کچھ تو میرا مان رکھا ہوتا مگر نہیں تقدیر نے میرا یہ وعدہ بھی جھوٹا کر دیا۔اقرا کے ابو

کی پاکستان ٹرانسفر کی خبر میری سماعت پر کسی بم کی طرح پھٹی۔۔ میں جو یہ سمجھ کر سکون سے بیٹھی تھی کہ سارہ کا گمشدہ بچپن اقرا میں دیکھوں گی، سب وعدہ خلافیوں کی تلافی کر دوں گی۔میں اپنی اور اقرا کی آپسی کشش کو خدا کی مستقبل کی پلاننگ سمجھ کر مطمئن تھی کہ اس "یا" کا جواب شائد اسی میں تھا کہ اقرا کی ماں کو جانا تھا اور اسے میں نے پالنا تھا۔۔اسی لئے خدا نے ہم دونوں کے دل ایک دوسرے کی محبت سے بھر دئے تھے۔۔مگر سب خیالی محل دھڑام سے زمین پر گر گئے۔سارہ پھر سے اکیلی ہونے جا رہی تھی۔۔۔۔میرے دل میں جدائی کا ایک اور گھاؤ لگنے والا تھا اور میرا ایک اور وعدہ ٹوٹنے جا رہا تھا۔۔

آج کینیڈا میں اقراء کا آخری دن ہے۔میں اسے میکڈونلڈ کھلانے لے کے جا رہی ہوں۔ایکدم سے میرے گلے لگ کے رونے لگ گئی ہے۔پانچ سال کی بچی، اپنی ماں کی لاش سے لپٹ کر بھی ایسے ہی روئی تھی۔سب حیران رہ گئے تھے کہ اتنی سی بچی کو کیسے موت پر رونا آتا ہے اور میں اب بھی حیران رہ گئی ہوں۔۔ہم نے اپنی طرف سے اس سے مستقل جانے کی خبر یہ کہہ کر چھپائی ہے کہ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں پاکستان اپنے نانا، نانی اور دادی کو ملنے جا رہی ہے۔۔"اقرا چھٹیوں کے بعد آ جاؤ گی آپ۔۔"

" تو پھر آپ ہمارے ساتھ چلیں۔۔۔۔ وہ روتے روتے کہتی ہے۔۔" میں بعد میں آؤں گی۔"۔میں آنسو ضبط کرتے ہوئے کہتی ہوں۔

میرے اس جواب کو سن کے وہ ایک دم روتے روتے چپ کر گئی ہے:

" ماما آپ کو ایک سیکرٹ بتاؤں۔اور ساتھ ہی خوفزدہ نظروں سے ساتھ بیٹھے احمد کو دیکھتی ہے جیسے کوئی بہت بڑا گناہ چھپانا مقصود ہو۔۔۔

"بولو اقرا۔۔" میں اسے سینے سے چمٹاتے ہوئے کہتی ہوں۔۔

"احمد کو نہیں بتانا، کسی کو بھی نہیں بتانا۔۔۔۔۔۔۔"

" کسی کو نہیں بتاؤں گی۔۔" میں ایک اور جھوٹا وعدہ کرتی ہوں۔

" آپ میری ماما نہیں ہیں، میرے پاس صرف ابو ہیں۔۔۔۔۔"

" نہیں اقراء۔۔" میں ٹوٹی ہوئی آواز میں کسی مرتے ہوئے شخص کی طرح بولتی ہوں۔

"ہاں ماما" وہ بڑے مضبوط انداز سے مجھے دیکھتے ہوئے کہتی ہے جیسے اب بحث کی گنجائش نہ ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور پھر وہ زندگی میں پہلی دفعہ میرا لایا ہوا برگر کھانے سے انکار کر رہی ہے۔۔۔۔۔۔۔

اور پھر ائیر پورٹ کے آخری دروازے کے اندر داخل ہوتے اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "ماما، جو جھوٹ میں نے اپنے آپ کو بہلانے کے لئے بولا تھا، اس کی مدت ختم ہوگئی ہے۔"

مجھے وعدے توڑنے کی سزا تو ملنی ہی چاہیئے تھی۔جن چہروں پر خوشی دیکھنے کے لئے ان کی ماؤں سے ضدیں لگاتی تھی، وہ چہرے دنیا کی بھیڑ میں اکیلے چھوڑ دیئے۔۔سارہ کا بچپن میرے بغیر گذر گیا تھا، اقراء بھی اپنا بچپن میرے بغیر گذارنے ائیر پورٹ کے آخری دروازے میں داخل ہوگئی ہے اور اس کی آنکھوں میں ان تمام جھوٹے وعدوں کی کرچیاں نظر آ رہی ہیں، جنہیں اب ساری عمر میرے جسم میں چبھنا ہے۔

کینیڈا کی لڑکیاں۔۔اُوں ہوں!!

کینیڈا میں آئے ہیں تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ شرم وحیا ہی بھول جائیں اور اپنی ثقافت اور مذہب چھوڑ دیں۔۔کیڑے پڑیں میری نند کو۔رخسانہ اتنا تُرش بول رہی تھی کہ کھانا اس کے حلق میں مرچیں بھر رہا تھا اور اتنا تیز بول رہی تھی کہ کمرے میں موجود سب خواتین اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور نظر آتی تھیں۔ویسے تو آہستہ بولنا اس کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔مگر آج تو اس کا دل غم اور غصے سے پھٹا جا رہا تھا اسلئے آواز کا پھٹنا بھی فطری تھا۔

جو عورتیں اس کے مزاج سے واقف تھیں انہوں نے نہایت تابعداری سے سر کو زور زور سے اس کی بات کی تائید میں ہلانے میں ہی عافیت جانی۔کچھ کا تو رخسانہ کی دہشت سے سر ایسا بے ساختہ اور بے لگام ہلنا شروع ہوا کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔رخسانہ کی ہاں میں ہاں نہ ملانے یا ہلکی آواز میں تائید کرنے کا مطلب آدھی موت تھا،اور پوری موت اس صورت آتی جب کوئی اس کی رائے سے اختلاف کرنے کی گستاخی کر بیٹھتا۔یہ ہمت نہ اس کے شوہر کو تھی نہ جوان بچوں کو،اور نہ بچاری سٹریٹ کی ان معصوم عورتوں کو،اور یہ عورتیں رخسانہ کی غیر موجودگی میں اکثر اس بات پر حیرت کا اظہار کرتی تھیں اور رشک میں مبتلا رہتی تھیں کہ اس کے پاس کون سا ایسا گُر ہے کہ میٹرک فیل ہونے کے باوجود کینیڈا جیسے ملک میں رہتے ہوئے،شوہر اور بچوں کو ایسی نکیل ڈال کے رکھی ہوئی ہے کہ اس کے سامنے دم مارنے

کی جرأت نہیں کرتے۔کینیڈا میں شوہروں کا بیویوں کی غلامی کرنا تو کوئی ایسی اچنبھے کی بات نہیں تھی مگر بچے۔۔۔؟وہ بھی یہاں کے سکولوں کے پڑھے ہوئے،جہاں" کے جی" سے ہی بچوں کو سکھایا جاتا ہے کہ ماں باپ اونچی آواز میں بات بھی کریں تو 911 ملانا ہے اور بس ۔۔آگے اللہ اللہ خیر صلا۔۔مگر رخسانہ کے بچے کھانے پینے،دوستوں سے ملنے،نوکری کرنے یا کچھ بھی کرنے کے لئے ماں کی اجازت کے بغیر پر بھی نہیں مارتے تھے۔عورتوں نے کئی دفعہ حیلے بہانے سے رخسانہ سے یا اس کے بچوں سے اس " تابعداری" کا راز اگلوانے کی کوشش کی مگر رخسانہ نے ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ" بس میں نے اپنے بچوں کی تربیت کے لئے دن رات محنت کی اس لئے خدا نے مجھے یہ صلہ دیا ہے" اور پوچھنے والیاں یہی سوچتی رہ جاتیں کہ "ہائے ہائے ہماری تربیت میں کیا کمی رہ گئی کہ بچے بات سن کے ہی نہیں دیتے،دوستوں کے انتخاب اور نوکریوں کے مشورے تو دور کی بات وہ تو کھانا تک ان کی مرضی سے نہیں کھاتے تھے۔"

اور رخسانہ کے بچوں کے جوابات سے مل جل کر یہ اندازہ لگایا گیا کہ "امی حضور روئی کی طرح دھنکنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگاتیں"،الجھن وہیں کی وہیں کھڑی رہتی کہ بچے اس ملک میں رہ کر اور اتنے بڑے ہو کر کیسے چپ کر کے مار کھاتے اور پھر تابعدار بھی رہتے۔۔۔

اور آج اس کے منہ سے اپنی ہی نند کے بارے میں کلمات سن کر مریم کے گھر اکٹھی ہونی والی عورتیں دم بخود رہ گئیں۔۔اب بات پتہ نہیں کدھر کو نکل جائے۔۔؟سب کی آنکھوں میں گھبراہٹ بھرا سوال ابھر آیا تھا۔

ایک نئی خاتون جو ابھی ابھی اس سٹریٹ میں موو ہوئی تھی،اس نے اپنی غفلت میں سوال کو الفاظ دے دئے۔۔

کیا ہوا آپ کی نند کو۔۔؟

رخسانہ نے پہلے تو سوال کرنے والی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا، کیونکہ پرانی عورتوں نے تو اس کی بات کو نظر انداز کر دینا تھا اور کوئی اور موضوع چھیڑ دینا تھا۔

"یہ نہ پوچھو کیا ہوا، یہ پوچھو اس نے کیا کیا؟ ارے ہندو سے شادی کر لی ایسی نا ہنجار نکلی، میرے شوہر تو خاندان میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گئے۔۔"

"اوہ یہ تو بہت افسوس کی بات ہے۔۔" سب خواتین نے نند کی اس حرکت پر مل کر مجبوراً خوب لعنت ملامت کی۔۔

نئی خاتون شائد کینیڈا کے رنگ میں کچھ زیادہ ہی رنگ چکی تھی ,بڑی معصومیت سے بولیں۔۔

"تو پھر کیا ہوا ان کی زندگی ہے، اگر انہوں نے ہندو سے شادی کر لی، آخر کچھ تو سوچا ہوگا۔۔"

اب رخسانہ کی آنکھوں میں انگارے بھر گئے۔۔ "نام کیا ہے آپ کا بی بی۔۔؟

"میرا۔۔۔" ابھی وہ خاتون بولنے ہی لگیں تو رخسانہ ایسے تیز لہجے میں بولی کہ اس خاتون کی آواز گلے میں ہی دب گئی اور اسکی جگہ ایک ہلکی سی سیٹی سی نکل گئی۔۔

"اچھا پھر یہاں کی ہکڑ اور پاکستان کی ہکڑ میں کیا فرق رہ گیا ہے۔۔۔ بولیں ذرا ۔۔کیا نام ہے آپ کا۔"

"صدیقہ۔۔۔" میزبان نے جلدی سے اس غریب کا نام بتا دیا۔۔

"ہکڑ کیا؟ صدیقہ کی سادگی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔۔ یا وہ hooker کو سمجھنا نہیں چاہ رہی تھی، رخسانہ ''ر'' پکی لاہوری ہونے کی وجہ سے لڑھکتی تھی۔۔اس لئے اس خاتون کو لگا کہ "نہیں نہیں اس نے وہ نہیں کہا ہوگا۔۔۔"

کمرے میں موجود زیادہ تر خواتین اپنی ہنسی چھپانے کی کوشش میں ادھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔۔

ایک نے بات بدلنے کے لئے آج کی دعوت میں موجود کھانوں کی تعریف کی کوشش کی۔۔

"مٹن قورمہ بہت مزے کا تھا کس نے بنایا تھا۔۔"

دوسری اس سے بھی زیادہ تیزی سے بولی "میں نے"

یہ پاٹ لک (ون ڈش پارٹی) ہر بدھ کو کسی ایک کے گھر ہوتی تھی، دوپہر کا وقت جب سب شوہر حضرات دفتروں میں اور بچے سکولوں میں تو یہ گھروں میں رہنے والی عورتیں "تبدیلی" کی خاطر یوں اکٹھی ہوتی تھیں۔ایک دوسرے کے ہاتھوں کے کھانے کھاتیں اور جو اٹھ کر جلدی چلی جاتی یا موجود نہ ہوتی اس کی کمیوں کجیوں پر پر مغز گفتگو کرتیں۔ پاکستان سے دور، رشتے داروں سے دور، سارا دن گھروں میں روٹین کے کام کرتے کرتے تھکن اتارنے کا ان کے پاس یہی ایک راستہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر یہاں بھی ایسی سیاست پکتی کہ بیک ہوم میں چھوڑی ہوئی ساسوں اور نندوں کی یاد تازہ ہو جاتی۔مگر پھر بھی یہ سلسلہ کئی مہینوں سے ایسے ہی کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا کیونکہ جو عورت زیادہ گڑ بڑ کرتی وہ خود بخود اس اجتماع سے خارج ہو جاتی تھی۔باقی آپس میں مفاہمت کا راستہ چُن لیتیں اور قیدِ تنہائی سے بچ جاتیں۔کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ یہ دنیا عقلمندوں کی ہے، دماغ کے بغیر تو کوئی kitty parties کا بھی زیادہ دیر تک ممبر نہیں رہ سکتا۔

رخسانہ چونکہ زبان کی اور دماغ کی تیز ہونے کی وجہ سے پروپیگنڈا پھیلانے کی بھی ماہر تھی، اس لئے ایسی پارٹیوں کا ناگزیر حصہ بلکہ بے تاج ملکہ ہی تھی، اسے ناپسند کرنے کے باوجود کوئی بھی اس سے دشمنی مول لینے کی جسارت نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ وہ مخالفین کو ایسے

کچلتی کہ کیا امریکہ سر اٹھانے والے غریب ملکوں کو کچلتا ہوگا۔اس لئے اس کی بھی نہ دشمنی اچھی نہ دوستی۔رخسانہ نام کی اس ہڈی کو عورتوں نے حلق میں پھنسا رکھا تھا، نہ اُگل سکتی تھیں اور نہ نگل اور یہ ہڈی بس چبھتی ہی رہتی تھی۔۔ابھی بھی موضوع بدلنے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی اور بات نند کو کوسنے دینے سے آگے نہ بڑھ سکی۔۔اور سب خواتین بے بسی سے اس پر بات کرتی رہیں۔

میزبان نے چائے کے پیالے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے تھوڑی سی ہمت کی اور بات کو نند کی شادی سے پھیلا کر بچوں کی شادیوں کے مسئلے تک لے گئی۔۔آج کل تو یہاں بچوں کی شادیوں کا بہت مسئلہ بن چکا ہے۔

"ہاں! اب تو ماشاءاللہ ایک نسل ادھر جوان ہوگئی ہے۔لیکن سمجھ نہیں آتی بچوں کے رشتے یہاں سے ڈھونڈیں جائیں یا پاکستان سے۔"۔ایک اور خاتون نے میزبان کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا جیسے بات چائے کی پیالی سے چھلک نہ جائے۔۔

"میں نے تو اپنے بیٹے سے کہہ دیا ہے کہ یہاں خود ہی اپنے مذہب اور ملک کی لڑکی ڈھونڈ لے، میں تو پاکستان سے بیوی لانے کے حق میں نہیں ہوں۔۔"ایک عورت نے اپنے فیشن ایبل بالوں کو جھٹکتے ہوئے قدرے لاپرواہی سے کہا۔۔

"ہیں۔۔یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ رخسانہ نے نند کی شادی سے زیادہ اس مسئلے کو سنگین پایا تو سب عورتوں کے ساتھ اسی موضوع پر طبع آزمائی کرنے لگ گئی:

"یہاں کی لڑکیوں سے اپنے لڑکوں کی شادیاں کریں؟۔۔یہ کہہ رہی ہیں آپ؟۔۔

رخسانہ نے ناک چڑھا کر انتہائی نخوت سے کہا تو کہنے والی بھی گھبرا گئی اور اپنے خیال کے دفاع میں کہنے لگی۔۔

"ہاں نا ایک تو سپانسر شپ کے جھمیلے، دوسرا یہاں کے پلے بڑھے لڑکوں کا مزاج

بالکل فرق ہوتا ہے، پاکستان کی لڑکیوں کو یہاں آ کر ایڈجسٹ کرنے میں ہی اتنا وقت لگ جاتا ہے۔۔"

"بالکل ٹھیک کہا زینب آپ نے اور پھر پیچھے گھر کو بھی یاد کرتی رہتی ہیں۔۔یہاں کی ہی فیملی ہو تو یہ مسئلے نہیں ہونگے۔"۔میزبان نے بھی پاکستان سے امپورٹ ہونے والی بیویوں کو رد کرتے ہوئے کہا۔۔

یہاں کی لڑکیاں؟ یہاں کی؟۔۔رخسانہ نے لڑکیوں کا لفظ ایسے دانتوں کے نیچے چبایا جیسے کینیڈا میں پلنے والی ساری لڑکیوں کو دانتوں کے نیچے رکھ کے چبا جائے گی۔۔

"بے لگام، آزاد، گھروں کو نہ بسانے والی۔۔ہوک۔۔(ہوکر کا لفظ منہ میں کچھ سوچ کر دم توڑ گیا)۔۔میں تو مر کر بھی اپنے بیٹے کی شادی یہاں نہ کرتی اسی لئے میں نے تو اپنی بہن کی بیٹی سے اپنے بیٹے کا نکاح کیا ہوا ہے۔پاکستان میں رہنے والی شریف لڑکی، سب سے بڑھ کر گھر کی دیکھی بھالی۔۔کینیڈا میں آ کر سب اپنی تہذیب بھول کر آزاد خیال ہونے کے چکر میں بچوں کو ایسی باتوں کی اجازت دے دیتے ہیں۔میں نے تو اتنا کنٹرول رکھا ہوا ہے کہ ہل نہیں سکتے۔۔"

اس بات پر کافی عورتوں نے ناگواری کا اظہار کیا مگر محفل کو بوجھل ہونے سے بچانے کے لئے ایک دفعہ پھر سے آنکھوں ہی آنکھوں میں درگزر اور اجتناب کا فیصلہ کیا گیا
۔

پھر بھی ایک عورت سے رہا نہ گیا: " تو کیا آپ کے بیٹے نے کچھ نہیں کہا؟ یہاں کے بچے تو کزن میرج کے سخت خلاف ہیں"

اتنی جرات اُس کی۔۔میں نے اسے پیدا کیا ہے، اس نے نہیں۔بول کے تو دکھائے۔۔

بچے چیز ہی کیا ہوتے ہیں، ہمارے گندے پانی سے نکلی ہوئی بے بس مخلوق، جنہیں ہم اپنا

دودھ پلا کر بڑا کرتی ہیں۔۔۔اور بی بی کزن میرج کے اسلئے خلاف ہوتے ہیں کیونکہ انہیں ماں باپ نے اسلام کی صحیح تعلیم نہیں دی ہوتی۔"

ان تند و تیز کاٹ دار جملوں کے بعد بحث کی گنجائش سر چھپا کر بھاگ گئی۔۔ کچھ لمحوں کے لئے کمرے میں صرف چائے پینے کی آواز رہ گئی.

پھر ایک دن ایسی ہی کسی پارٹی میں رخسانہ مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ، سر پر معمول سے زیادہ کس کر سکارف باندھے، تقریباً خوشی سے ناچتی اور سب کو فخر سے یہ خبر سناتی پھر رہی تھی کہ

"اس کی بھانجی یعنی کہ اس کے بیٹے کی دلہن کو ویزہ مل گیا ہے اور وہ عنقریب کینیڈا آنے والی ہے اور پھر تم لوگ سب دیکھنا کہ کیسے پاکستان کی لڑکیاں گھروں کو بساتی ہیں۔۔ ارے یہاں کی لڑکیوں کے تو گھر بسانے والے لچھن ہی نہیں ہوتے۔۔اتنی آزاد اور منہ پھٹ ہوتی ہیں اور سب سے بڑی بات اس آزاد نہ ماحول میں نجانے باہر کیا کیا کرتی پھرتی ہیں۔۔"

سٹریٹ کی سمجھدار عورتوں نے ایک دفعہ پھر سے بردباری اور تحمل کا مظاہرہ کیا اور خوشی کے موقعے پر کسی بھی بدمزگی سے بچنے کے لئے، رخسانہ کے اس طویل لیکچر کے بعد بھی کوئی بحث نہیں کی اور صرف مبارکباد دینے پر اکتفا کیا۔۔ایک دو عورتوں کے صبر کا پیمانہ ضرور لبریز ہوا خاص کر کہ جس نے پہلے کہا تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کو کینیڈا میں ہی خود ہی لڑکی پسند کرنے کو کہہ رکھا ہے مگر رخسانہ جیسے شیر کے منہ میں کون ہاتھ ڈالتا لہٰذا خاموشی ہزار نعمت کا ورد دل میں پڑھ کر رخسانہ کی خوشی میں مصنوعی ہنسی ہنستی رہیں۔۔

آج منگل کا دن تھا۔ وہ تو ہر ہفتے آتا ہے مگر یہ منگل پی آئی اے کی وہ فلائٹ کینیڈا لا رہا تھا، جس میں رخسانہ کے بیٹے کی دلہن، اس کی اپنی بھانجی آ رہی تھی۔ اس نے اور اس

کے بیٹے نے یہ دن انگلیوں پر گن گن کر کاٹے تھے اور آج انتظار دیدار میں بدل رہا تھا۔ رخسانہ کے بیٹے حسن نے تو کبھی اپنی منکوحہ سے کھل کر فون پر بھی بات نہیں کی تھی کیونکہ اس کی امی نے کہہ رکھا تھا کہ شادی سے پہلے بات کرنے یا زیادہ قریب رہنے سے بے برکتی ہوتی ہے، مانا نکاح ہو چکا ہے مگر رخصتی کے بغیر فون یا سکائپ پر قربت بھی گناہ ہے۔ اور حسن نمانے کی کیا جرات کے وہ ماں کی بات سے انکار کر سکتا، اس کے ذہن میں بچپن سے ہی یہ بات گھوٹ گھوٹ کر بٹھا دی گئی تھی کہ ماں ناراض تو خدا ناراض اور خدا ناراض تو سمجھو دنیا میں آپ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔۔۔رخسانہ کی بھانجی بھی اس کی تابعدار تھی اب تو آگے بھی خالہ ہی کی چلنے والی تھی، اس لئے رخسانہ کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ اس نے اپنے گھر میں ہمیشہ کے لئے حکمرانی قائم رکھنے کی دوررس ترکیب لڑائی تھی، اور آج جب وہ ائیر پورٹ بھانجی کو لینے جا رہی تھی تو سوچ رہی تھی کہ:

"ناکام وہ لوگ ہوتے ہیں، جو بے وقوف ہوتے ہیں، اللہ کا شکر ہے میں نے ہمیشہ عقل سے فیصلے کئے اور میرے ہاتھوں سے کبھی کچھ نہیں نکلا۔۔"اس خاموش چہرے سے فتح کی مسکراہٹ ہونٹوں کے کناروں سے نکل نکل کر پورے چہرے پر پھیلنے لگی تو گاڑی میں ساتھ بیٹھے اس کے سدا کے مسکین شوہر نے پوچھا: کیا ہوا رخسانہ بیگم؟"

"کچھ نہیں میں سوچ رہی ہوں اب دیکھنا ان بحث کرنے والی عورتوں کو کیسا منہ توڑ جواب ملے گا، جب میری بھانجی میرے کنٹرول میں رہ کر ہمارا گھر سنبھالے گی تب انہیں پتہ چلے گا کہ یہاں کی خودسر، پھوہڑ اور آزاد خیال لڑکیوں سے شادی کرنے اور پاکستان کی شریف اور سگھڑ لڑکیوں سے شادی کرنے میں کیا فرق ہوتا ہے۔۔۔"

"ارے بیگم خدا کا خوف کرو ہماری بھی بیٹی یہیں کی پڑھی لکھی ہے۔۔"

شوہر کے منہ سے نجانے کیسے خوفناک بیوی کے خیال کے مخالف جملے نکل گئے،

شائداس کی آنکھوں میں اپنی معصوم اور شریف بیٹی کا چہرہ گھوم گیا تھا۔ جو کینیڈا میں ہی پیدا ہوئی تھی مگر ماں کی چالاکیوں اور سختیوں کی وجہ سے گھبرائی اور ڈری ڈری رہتی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کینیڈا میں رہنے والی لڑکی ہے۔ اور اس بات کا سوفی صد کریڈٹ رخسانہ اپنے آپ کو دیتی تھی۔ اس کی بیٹی جب خوفزدہ نظروں سے ماں کو دیکھتی تھی تو رخسانہ کا کلیجہ کانپتا نہیں تھا بلکہ وہ مطمئن ہوجاتی تھی کہ اس کی تربیت میں کوئی کسر نہیں رہ گئی اور کینیڈا میں رہتے ہوئے بھی اس نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو بڑوں کا ادب لحاظ اور شرافت سکھائی ہے۔

"لعنت تمھاری سوچ پر، رخسانہ تو جیسے پھٹ ہی پڑی۔۔ شرم کرو اپنی معصوم بچی کو کن چنڈال لڑکیوں سے ملا رہے ہو۔۔ یہاں کی لڑکیوں سے؟ رخسانہ کا لمبا ناک" یہاں کی لڑکیاں" کہتے ہوئے حسبِ عادت نخوت سے دو سینٹی میٹر اوپر چڑھ گیا، میاں! میں نے پالا ہے اسے۔۔ رخسانہ نے اپنے سینے پر زور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔۔ میں نے، تمھاری بھگوڑی بہن نے نہیں۔۔ ارے شرم۔۔

ا" چھا اچھا تم ٹھیک کہہ رہی ہو" ڈرائیو کرتے ہوئے بیٹے کے سامنے اپنی، اپنی بہن اور اپنے پرانے خاندان کے صدیوں پرانے اور نئے گناہ سننے کی آج کے دن اس میں تاب نہیں تھی، "اب تو بہو بھی آنے والی ہے۔۔ اس عورت کی زبان سے اور ہاتھوں سے نئی آنے والی بچی کے سامنے اپنی عزت کیسے محفوظ رکھ پاؤں گا۔۔" اس سوچ سے ہی اس کے پورے جسم میں کپکپی طاری ہوگئی۔

بیٹے نے بھی باپ کی درگت بنتے دیکھ کر یہی سوچا۔۔" کیسے اپنی بیوی کے سامنے اپنی اور باپ کی عزت بچا پاؤں گا۔۔"

رخسانہ نے خوشی کی اس گھڑی میں بات کو طول دینے کی بجائے میاں کو وقتی طور پر

معاف کر دیا۔۔ اور پھر سے دھیرے دھیرے مسکرانے لگی۔ ائیر پورٹ پہنچ کر رخسانہ مسافروں کو ریسیو کرنے والوں کے ہجوم میں تیزی سے راستہ بناتی ہوئی سب سے آگے جنگلے پر تقریباً لٹک سی گئی۔ بیٹی، بیٹا اور شوہر پیچھے ہی کھڑے رہ گئے، ان میں رخسانہ جیسا ٹیلنٹ نہیں تھا، انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی ہیں، مگر رخسانہ وہاں بھی ادھر ادھر کھڑے لوگوں کو مفت مشورے، نصیحتیں، اپنی کامیابی کے راز بتانے لگی، کبھی کبھی پیچھے مڑ کر وہ اپنی فیملی کو بھی دیکھ لیتی، بیٹے کو تھمبز اپ دکھاتی، اور بیٹی سے نظریں چار ہوتیں تو اسے سکارف اور کسنے کا اشارہ کرتی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسکی بھانجی کو آتے ہی پتہ چل جائے کہ میری بیٹی کیسے سکارف باندھتی ہے تاکہ وہ پر پرزے نکالنے کا سوچے بھی نہ۔۔ اس کے علاوہ بھی وہ بھانجی کو قابو میں رکھنے کے طریقوں پر غور کرتی جا رہی تھی۔ فکر کے وقفے میں وہ لوگوں سے باتوں میں مشغول ہوجاتی اور لاپرواہی سے سوچتی" بھانجی ہی تو ہے"۔۔

اور آخر کار انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور فلائٹ آگئی پھر ائیر پورٹ کے اندرونی دروازے سے مسافر نکلنے شروع ہوگئے۔ رخسانہ کا دل خوشی کے مارے بے قابو ہو رہا تھا۔

ہائے اتنے سالوں بعد دیکھوں گی، پہچان تو لوں گی؟ کیوں نہیں۔۔ خون ہے میرا۔۔ نہ جانے اسے کیوں کھڑے کھڑے وہم ہونے لگا کہ وہ اسے پہچان نہیں پائے گی، اسی کشمکش میں مدد لینے کے خیال سے مڑ کر حسن کو دیکھا مگر اس نے تو اپنے بیٹے کو اپنی منکوحہ سے بات تک کرنے کی اجازت نہیں دی تھی یہ کہہ کر کہ شادی سے پہلے ایسی حرکتوں سے نحوست ہوتی ہے، اس لئے اب بھی وہ ماں پر سب چھوڑے لاپرواہی سے اپنی بہن اور باپ سے باتوں میں مصروف تھا۔

" بھانجی ہے خود ہی بھاگ کر لپٹ جائے گی۔۔" اس نے مسکرا کر سوچا اور سکون سے ریلنگ کے اوپر مزید جھک گئی۔۔ حسن ماں کے ڈر سے نہ خوشی کا اظہار کر رہا تھا نہ

بے صبری کا۔۔بس دل میں سب جذبات دبائے نارمل نظر آنے کی کوشش میں ائیر پورٹ کے جناتی دروازے کو کھلتے ،مسافروں کے باہر نکلتے ،اور بند ہوتے دیکھنے سے اجتناب کر رہا تھا۔مگر ایکدم باپ اور بہن سے باتیں کرتے اسے محسوس ہوا کہ بہت دیر ہوگئی ہے اور تقریباً تمام مسافر نکل چکے ہیں۔اب اندرونی دروازہ بہت دیر سے کھلا بھی نہیں۔۔اس نے برسوں کی عادت کے مطابق اپنی ماں کی طرف دیکھا۔وہ ریلنگ پر سر رکھے رکھے شائد سو گئی تھی۔۔مسافروں کو لینے کے لئے آنے والے تقریباً سب لوگ جا چکے تھے۔۔

یہ کیا؟ ابو دیکھیں سب مسافر تو لگتا نکل آئے ہیں،تو کیا ماریہ اسی فلائٹ سے نہیں آ رہی تھی؟حسن کے چہرے پر اب تشویش کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔

"ارے ہاں، یہ کیا گڑ بڑ ہے۔۔ابو نے بھی ایک دم چونک کے دیکھا۔۔" نیک بخت،انہوں نے وہیں سے رخسانہ کو پکارا۔۔

وہ ایکدم چونک کے سیدھی ہوئی۔۔

"ارے یہ کیا سارا ائیر پورٹ خالی کیوں ہو گیا؟ ماریہ کیوں نہیں نکلی؟"

"پہلی دفعہ آ رہی ہے شائد اندر امیگریشن میں دیر ہو رہی ہے ، کوئی مسئلہ نہ ہو امی،حسن نے وسوسہ بھری نظروں سے ماں کو دیکھ کے کہا۔۔

"مسئلہ کیا؟ وکیل کو اتنی فیس دے کر یہ کیس کروایا ہے،مسئلہ کیا۔۔؟ وہ جیسے بیٹے کو نہیں خود کو تسلی دے رہی تھی۔۔

"فلائٹ تو آج ہی کی تھی نا؟" رخسانہ نے حسن کا اندیشہ دہرایا۔۔

"ہاں ہاں حسن کی ماں آج ہی کی تھی ، میرے فون پر ابھی بھی فلائٹ کا نمبر، دن اور وقت سب موجود ہے جو تمھارے بہنوئی نے بھیجا تھا،

لو دیکھو ابھی نکال کے تمھیں دکھاتا ہوں۔۔"

"جلدی دکھاؤ، میرا تو دل اڑا جا رہا ہے۔۔کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو میری بچی کو، اندر نہ بٹھا چھوڑا ہو، معصوم سی جان،کبھی باہر کی ہوا نہیں لگی اسے، گھر کے اندر بند رہنے والی بچی، اکیلی آ رہی تھی۔۔جلدی دیکھو یہی فلائٹ ہے؟"

"یہ نہیں ہے؟ تمھارا رنگ کیوں زرد ہو گیا ہے؟ مجھے پتہ تھا یہ نہیں ہو گی فلائٹ ، اگلے منگل کی ہو گی،تم انتہائی نکمے انسان ہو،تم سے کچھ ٹھیک سے نہیں پڑھا جاتا, فضول میں اتنا پٹرول لگ گیا، پارکنگ کے اتنے پیسے بن گئے ہوں گے، وقت الگ برباد،حسن کو فضول چھٹی کروائی۔۔کم بخت دھیان سے نہیں پڑھ سکتے کچھ،اب منہ سے قبولو، گم سم کیا کھڑے ہو۔۔غلط تاریخ پڑھی ہے نا؟

"نہیں یہی تاریخ ہے ، یہی وقت ، ہے اور یہی فلائٹ ہے ۔۔۔۔۔مگر مگر ۔۔۔۔۔۔"

" کیا مگر مگر؟ کیا مگر مگر۔۔۔۔۔"

"حسن یہ پیغام ہے ماریہ نے ،تمھاری بیوی نے اور پھر اپنی خونخوار آنکھوں سے گھورتی بیوی کو دیکھتے ہوئے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور تمھاری بھانجی نے میرے سیل فون پر ہی بھیج دیا ہے لو پڑھ لو۔۔"

"پیغام؟۔۔کیا؟ پڑھو جلدی حسن جلدی پڑھو۔۔میرا دم نکلا جا رہا ہے، اپنی بہن کو کیا جواب دوں گی؟ اس کی معصوم بیٹی۔۔

"امی ۔۔چپ کریں۔۔چپ کر کے سنیں" ،پہلی دفعہ اس نے حسن کی آنکھوں میں شدید غصہ دیکھا تو سہم گئی۔۔۔

" آپ کی معصوم بھانجی لکھتی ہے، میرا ائیر پورٹ پر انتظار کر کے اپنا وقت برباد نہ کریں ، میں خیریت سے کینیڈا پہنچ گئی ہوں اور جہاں جانا تھا ادھر کو روانہ بھی ہو چکی ہوں ،

میں خالہ کا یا کسی بھی فیملی کے بندے کا سامنا نہیں کرنا چاہتی ۔مگر مجھے یہ پتہ ہے کہ میں نے اپنی خوشی اور اپنی محبت کی خاطر جو کیا ہے وہ ٹھیک ہے ۔ میں اپنے کئے پر شرمندہ نہیں ہوں ۔میں نے حسن کے ساتھ نکاح کا سہارا خود نہیں لیا، بلکہ آپ لوگوں نے مل کر مجھے مجبور کیا کہ میں ایک ایسے انسان کے ساتھ شادی کروں جس سے میں نے کبھی ٹھیک سے بات بھی نہیں کی ، دیکھنا تو دور کی بات ۔ میں یہ نکاح ہی نہ کرتی مگر مجھے جس سے محبت ہے وہ امریکہ میں غیر قانونی طریقے سے رہ رہا تھا، جب میں نے اسے اپنے نکاح کے بارے میں بتایا تو اس نے ہی مجھے یہ آئیڈیا دیا کہ اپنے کزن سے نکاح کر کے کینیڈا آ جاؤ، اور جب میں یہاں کی شہری بن جاؤں تو اسے کینیڈا ہی سپانسر کرلوں ۔ سب اپنے لئے اچھا سوچتے ہیں اور محبت کرنے والے تو کچھ زیادہ ہی اپنے بارے میں سوچتے ہیں ۔ میں خود غرض نہیں ، نہ دھوکے باز ہوں کیونکہ میں نے ایک انڈین فلم میں سنا تھا کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے ۔سو خالہ خالو اور میرے نام نہاد شوہر، آپ لوگ میرا انتظار نہ کریں اور میں اپنے "ان کے" دوست کے ہاں ہی ٹھہروں گی جب تک میری طلاق اور دوبارہ شادی نہیں ہو جاتی ۔ میرے لئے یہ وقت مشکل ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ کینیڈا میں عورتوں کے پاس بڑے حقوق ہیں ۔۔آپ کے تعاون کا شکریہ ۔"

رخسانہ تو وہیں غش کھا کے گر پڑی اور حسن کے بدن سے جیسے کسی نے سارا خون ہی نچوڑ لیا ہو ۔۔اس دن وہ کیسے گھر پہنچے بس وہی جانتے تھے ۔

ماں کی تابعداری کے نتائج اتنے برے ہونگے کہ وہ دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا ۔۔ بے عزتی اور اس طرح استعمال ہونے پر اس کے اندر ایک لاوا سا پکنے لگا تھا اور اب وہ ماں کو بات بات پر کاٹ کھانے کو دوڑنے لگ گیا تھا ۔ گو کہ ماں نے اپنی ڈھیٹ فطرت کی وجہ سے شکست تسلیم نہیں کی تھی مگر وہ پرانے والا رعب بچانے میں بھی

اتنی کامیاب نہیں رہ گئی تھی ۔

رخسانہ نے جب پاکستان میں بہن سے بات کی تو وہ اتنا نقلی حیران اور پریشان ہوئی کہ اوورایکٹنگ کے نمبر بھی اسے نہ مل سکیں ۔رخسانہ جس سے لوگ اس لئے ڈرتے تھے کہ وہ بدنام کرنے کی ماہر تھی ۔اب بہن اور اس کی بیٹی کو بدنام بھی کرنا چاہتی تو نہ کر سکتی تھی کیونکہ اس میں اس کی اپنی لمبی ناک زیادہ کٹتی تھی ۔

رخسانہ نے خواتین کے لنچ گروپ میں جانا تو چھوڑ دیا، مگر وہاں تک بات پہنچنے سے نہ روک سکی ۔کسی کی غیر موجودگی میں ٹھٹھے لگانے کا ایسا نایاب اور حسین موقعہ ان عورتوں کو بھی زندگی میں پہلی بار ہی نصیب ہوا تھا، اور وہ بھی رخسانہ کے لئے ۔اس خبر کے بعد اس ہفتے عورتوں نے بدھ کے علاوہ جمعے کو بھی پارٹی رکھی کیونکہ ایکدن میں یہ قصہ ختم ہونے والا نہیں تھا اور کھانے میں مرچ مصالحہ کم ڈالا گیا کیونکہ اس "واقعہ" میں چٹخارے اور مصالحے بہت تھے ۔۔میزبان نے کہا" کھانے اور واقعے دونوں میں مصالحے تیز ہو گئے تو معدوں کا کیا بنے گا"۔۔۔کمرہ دیر تک قہقہوں سے گونجتا رہا۔

بیٹے کے قصے سے رخسانہ ابھی پوری طرح سنبھلی نہیں تھی کہ اُسے اب اپنی بیٹی کی فکر لاحق ہونے لگی ۔ کچھ تو ایسا ہو جس سے غم دور ہوں اور اس کا دبدبہ بھی واپس لوٹے ، اس کے گھر میں بہو کے آنے کے بعد نہیں بلکہ بہو کے ائیر پورٹ سے بھاگ جانے کے بعد، کنٹرول ختم ہو رہا تھا۔اس سے پہلے کہ گھر کی بادشاہت مکمل طور پر ہاتھ سے نکل جائے، گھر میں اپنی عقلمندی کی چھاپ پھر سے لگانی ضروری تھی ۔ ورنہ ایک طرف بیٹا گھورتا رہتا تھا اور دوسری طرف بے زبان شوہر کو ایسی زبان لگ گئی تھی کہ اب وہ اٹھتے بیٹھتے اسے ناسمجھی کے طعنے دینے لگ گیا تھا۔

" کسی اچھی جگہ بیٹی کی شادی، عزت بچانے کا اور کھویا ہوا وقار واپس لانے کا بس

یہی حل نظر آ رہا تھا۔۔"

مگر بیٹی کا رشتہ ڈھونڈنا بہت ہی مشکل کام ثابت ہو رہا تھا۔ بیٹے کے ساتھ ہوئے حادثے نے اسے پاکستان سے دولہا امپورٹ کرنے سے توتوبہ کروادی۔ اس لئے اب لڑکی کا بر کینیڈا میں ہی ڈھونڈنا تھا۔ کچھ دن گوشہ نشین ہونے کے بعد اس نے دوبارہ سے اسی حلقے میں آنا جانا شروع کر دیا۔ ہجوم میں نہیں بلکہ ایک ایک سے علیحدگی میں، تعلقات کی تجدید کی، جارحانہ رویئے کو پسِ پشت ڈال دیا کیونکہ بچپن میں اس کی ماں نے اسے یہی سکھایا تھا کہ گدھوں کو لاٹھی سے ہانکو، مگر ضرورت پڑنے پر انہی گدھوں کو فوراً باپ بنالو۔۔

اس لئے اس نے زینب کو فون کیا اور پوچھا:

" کیا شمیم اپنے بیٹے کے لئے لڑکی ڈھونڈ رہی ہے؟ یہ سوال زینب سے کرتے ہوئے اسے وہ دن یاد آ رہے تھے جب وہ اس گدھی کا مذاق اڑایا کرتی تھی کہ" مفت میں لوگوں کے کام کرواتی پھرتی ہو، اس کا کیا فائدہ ہوتا ہے (ان کاموں میں ایک دوسرے کو بچوں کے رشتے بتانا بھی شامل تھا)"

اور زینب عاجزی سے کہتی تھی کہ " فائدے کا تو کبھی نہیں سوچا بس کسی کا اچھا ہو جائے اور وہ دعا دے دے۔۔بس۔۔اور جب ہم اچھا کرتے جاتے ہیں تو اچھائی خود ہی ایک دن دروازے پر دستک دے کر واپس آپ کے پاس آجاتی ہی" ,رخسانہ اسے انتہائی غیر عملی عورت سمجھ کر ہمیشہ ناگواری سے ہی بلاتی تھی اور زینب اب بھی اسکے پرانے تیکھے رویئے اور کڑوی باتوں کو بھول کر اسکی بات کا سکون سے جواب دے رہی تھی:

"ہاں وہ دیکھ تو رہی ہے۔۔" زینب کی تصدیق نے جیسے رخسانہ کے اندر نئی امنگ جگا دی ہو۔

"میری بہن! تمھارا مجھ پر ساری عمر یہ احسان رہے گا اگر تم صرف اتنا کرو کہ شمیم کے کانوں میں ڈال دو کہ میں بھی بیٹی کا رشتہ دیکھ رہی ہوں۔۔میری بیٹی اتنی پیاری، شریف

اور تابعدار ہے کہ وہ خود بخود آگے بات چلائے گی۔۔پھر آگے یا قسمت یا نصیب۔۔۔میرا یہ کام کر دو گی نا۔۔؟ میں نے تمھیں ہمیشہ اپنی چھوٹی بہن سمجھا اور خدا تمھارے خلوص کا تمھیں صلہ دے گا۔تمھارے جیسے لوگ دنیا میں اب کہاں؟"

ہاں ہاں کہہ دوں گی مگر یہ تو بتاؤ کہ شمیم کو تو سعودی عرب سے کینیڈا آئے ابھی ایک دو سال ہی ہوئے ہیں، ابھی اس کا زیادہ لوگوں سے ملنا جلنا بھی نہیں، تم اسے کیسے جانتی ہو؟ زینب نے اُس سے پوچھا۔

"میں تو اسے ایک ہی بار ملی ہوں، نگہت کی بیٹی کی شادی پر، اپنے شوہر اور ماشااللہ سے تین جوان جہان بیٹوں کے ساتھ، دیکھنے میں سادی سی عورت لگی تھی مجھے۔مگر بیٹے اس کے تب ہی میں نے تاڑ لئے تھے۔ابھی ابھی سعودی عرب سے آئے ہیں تو یہاں کے لڑکوں کی طرح بگڑے ہوئے نہیں لگتے بڑی اچھی تربیت لگتی۔۔ ہے نا؟" رخسانہ نے سوالیہ نظروں سے زینب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔۔

"ہاں ہیں تو بہت ہی سعادت مند اور شریف لڑکے۔۔میں پوچھ دوں گی اسے تم فکر نہ کرو۔۔"

"ہاں تمھیں تو پتہ ہے پہلے ہی میں کتنے بڑے دکھ سے گذری ہوں۔۔" رخسانہ نے زینب کی نرم دلی کو جانتے ہوئے اپنا ہمدردی کا تیر پھینکا۔۔تیر نشانے پر لگا, کیسے نہ لگتا، رخسانہ نے اپنی مظلومیت اور زینب کی تعریفوں کا ایسا جال بچھایا تھا کہ اس معصوم عورت کا بچنا ناممکن تھا لہٰذا وہ تندہی سے اپنے مشن پر لگ گئی۔۔

اور پھر اگلے ہی دن زینب رخسانہ کو فون پر بتا رہی تھی کہ:

"میں نے شمیم سے بات کی تھی۔۔زینب نے ابھی اتنا ہی کہا کہ رخسانہ فرطِ جذبات سے لبریز ہو گئی۔۔

" کون کہتا ہے خون کے رشتے ہی بس کام آتے، تم نے تو بہنوں سے بھی بڑھ کر کیا۔

کل ہی میں نے تمھیں کہا اور آج تم نے بات بھی کر لی ۔۔ ورنہ کون کسی کا کام یاد رکھتا ۔۔ اللہ تمھیں بہت خوشیاں دے ۔۔۔۔۔"

"اللہ تمھیں بھی خوشیاں دے ۔۔ میں نے شمیم سے تفصیلی بات کی ، تمھارا بتایا ، تمھاری بیٹی کا ، گھر کا ۔۔۔"

"ہاں وہ تو فوراً سے ہی مان گئی ہوگی ، ارے بھئی اُسے میری بیٹی جیسی خوبصورت اور شریف لڑکی کینیڈا میں کہاں ملے گی ۔۔۔"

"ہاں اللہ اس کے نصیب اچھے کرے بڑی سعادت منداور پیاری بچی ہے ۔۔۔"

"میری ہی تربیت ہے بہن ,ورنہ یہاں کا حال تو پتہ ہی ہے ۔۔ رخسانہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زینب کو فون سے نکال کر گلے لگا لے ۔۔۔

"تمھاری تربیت اور سمجھداری سے کسے انکار ہے؟ مگر بات یہ ہے کہ شمیم اور اس کے بیٹوں کا خیال ہے کہ کینیڈا میں کوئی لڑکی شریف نہیں ہوتی ۔ بہت آزاد خیال اور من موجی ہوتی ہیں ۔ نہ گھر سنبھال سکتی ہیں اور نہ شوہر کو ۔۔ بوائے فرینڈ زرکھتی ہیں اور بس ۔۔۔۔"

"غضب خدا کا کسی کی بیٹیوں کے بارے میں ایسے منہ بھر کے تھوڑی کوئی کہتا ہے ۔۔ زینب تم نے انہیں بتایا نہیں کہ میری بیٹی حجاب لیتی ہے ، نمازیں پڑھتی ہے ، اونچی آواز میں بات نہیں کرتی ، قہقہہ لگا کے ہنستی نہیں ہے ، یہاں کی ٹین ایج لڑکیوں کی طرح اوٹ پٹانگ فیشن نہیں کرتی ۔ بتایا نہیں تم نے ؟ کسی کی بیٹیوں کے بارے میں ایسے منہ پھاڑ کے تھوڑی کہتے ہیں ۔۔ توبہ توبہ لوگوں کے دلوں میں خوفِ خدا بھی نہیں ۔ اپنی بیٹیاں نہیں تو کیا دوسروں کی بیٹیوں کی عزت کا بھی پاس نہیں ۔۔ بیٹیاں تو سانجھی ہوتی ہیں ۔ ہے کہ نہیں ؟

"جی بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں ۔۔ زینب نے اب کے الفاظ دانتوں کے نیچے اچھی طرح چبائے ۔۔۔

پھر خود کلامی والے انداز میں بولی اور میں نے شمیم کو بتایا کہ " بچی بہت معصوم اور

شریف ہے ، کینیڈا کی تو اسے ہوا بھی نہیں لگی اور سارا گھر سنبھال لیتی ہے ، ایک دفعہ دیکھ تو لیں اس بات پر رخسانہ شمیم تو چپ کر گئی تھی جیسے مان ہی گئی ہو مگر اس کے لڑکے نے کہا آنٹی ایسی لڑکیاں ماں باپ کے سامنے کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ ہوتی ہیں ، گھروں سے حجاب پہن کے آتی ہیں اور باہر آ کر مغربی کپڑے پہن لیتی ہیں اور یہ آزاد نظر آنے والی لڑکیوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں ، بڑی دوغلی ہو جاتی ہیں ۔

اور پھر پتہ ہے شمیم جو تھوڑا تھوڑا مان گئی تھی بیٹے کی بات سن کر کہنے لگی کہ " ہاں بھئی ، ایسی لڑکیاں جن کو ماؤں نے سختی سے پالا ہوتا ہے انہیں ڈبل رول کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے ، بہت گھنی ہو جاتی ہیں اور دنیا کو نچا چھوڑتی ہیں ۔۔۔ ہم تو کینیڈا سے نہیں بس پاکستان سے ہی لڑکیاں لائیں گے ۔۔"

"تم نے انہیں کہا میں نے اپنی بیٹی کو سختی سے پالا ہے؟ رخسانہ نے زینب کی بات اچکتے ہوئے غصے سے کہا ۔۔

"ایسے نہیں کہا ۔۔ ایسے کہا کہ بچی کی تربیت ماں نے بہت اچھی کی ہے ۔۔۔"

اور سختی سے کی یہ انہیں خواب آ گیا ؟ رخسانہ کی سوئی ادھر ہی اٹک گئی

"نہیں ظاہر ہے میں نے ہی کچھ ۔۔ لیکن ایسے نہیں ۔۔۔"

"ایسے نہیں تو کیسے ۔۔ تم لوگ حاسد ہو ، اس کے لڑکوں پر تمھاری اپنی کسی بھانجی بھتیجی کے لئے نظر ہو گی ۔۔ خدا نے تمھیں خود تو اولاد دی نہیں مگر تم میری بیٹی کا گھر بھی کیوں بساؤ گی ، پاکستان سے کوئی اپنی غریب رشتے دار لاؤ گی ۔۔ آئندہ مجھے فون نہ کرنا ایسی دوستیوں سے میں باز آئی " یہ کہتے ہی رخسانہ نے فون غصے سے فرش پر پٹک دیا ۔۔

اور دوسری طرف خلوص سے بھری مگر اولاد سے خالی جھولی والی زینب تھوڑی دیر پہلے اپنی ہونے والی تعریف اور اب کی تذلیل کو لے کر گھبرائی گھبرائی سی سوچ رہی تھی کہ بھلا رخسانہ کی کون سی بات سچ ہوگی ؟

ناشکری

چیاؤں چیاؤں چیاؤں۔۔۔۔۔۔

"ہائے اللہ! لگتا ہے پھر کسی نے بلو رانی کو پتھر مارا ہے"۔۔راحت نے درد میں ڈوبی بلو رانی کی چیخ سنی تو اس کا اپنا دل درد سے پھٹنے لگا۔

راحت کو آج بھی بلو رانی سے اپنی پہلی ملاقات یاد تھی۔جب وہ سجی سجائی کار سے دلہن بنی اپنے نئے نویلے دلہا اور نند کے سہارے نیچے اتری تھی تو اسے سب سے پہلا سلام بلو رانی نے ہی اُس کا سرخ لہنگا تھام کر پیش کیا تھا اور اس نے جب ایک کتے کو اپنا لہنگا چاٹتے دیکھا تو ڈر اور نفرت سے اس کی ایسی چیخ نکلی کہ سب حیرت سے دلہن کو تکنے لگ گئے تھے اور اگر وہ چار ہاتھوں کے سہارے میں نہ ہوتی تو یقینا گر ہی جاتی ، پھر جیسے ہی صورتحال سمجھ آئی سب باراتیوں نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

"لو جی بلو رانی نے تو نئی نویلی دلہن کو شرم وحیا ہی بھلا دی"۔۔ایک بوڑھی اماں نے پان کی لال پچکاری سے دیوار رنگین کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"یہ ہے بلو رانی ، جو اس محلے کی جان بھی ہے اور محافظ بھی ۔۔اس سے کبھی نہ ڈرنا۔۔" اس کے شوہر نے اس کے کان میں چپکے سے کہا تھا اور وہ خاموشی سے دل کی دھڑکنوں کو ترتیب میں لانے کی کوشش میں لگ گئی تھی ۔۔آتے ہی ایسی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا اسی لئے اس نے کمرے میں پیار بھری سرگوشیوں کے درمیان رُک کر اپنے

خاوند کو بتایا تھا کہ اسے کتوں سے بہت ڈر لگتا ہے بلکہ انہیں دیکھ کر اسے کراہیت محسوس ہوتی ہے۔۔

"میری جان یہ کتا نہیں ہے بلکہ یہ تو کتیا ہے ، مونث ۔۔یعنی کہ تیری برادری کی۔۔۔۔"

میری برادری کی؟ اُس نے اس مماثلت پر تُنک کر کہا تھا۔۔

" کہنے کا مطلب یہ ہے میری جان کہ کتوں سے بے شک ڈرتی رہو،مگر یہ تو عورت ذات ہے، بےضرر سی ، جو اس محلے کے سب لوگوں کو پیار بھی دیتی ہے اور ان کی حفاظت بھی کرتی ہے، یہ پیار کے قابل مخلوق ہے،اس سے کیسا ڈرنا ؟۔۔۔اچھا چھوڑو یہ نفرت کی خبر پھر کبھی دینا آج تو محبت دینے کی رات ہے"۔۔۔اور وہ کھسیانی سی ہو گئی تھی۔۔

"میں بھی کتنی بے وقوف ہوں، پہلی ہی رات کیا باتیں چھیڑ دیں۔"

مگر یہ حقیقت تھی کہ اسے کتوں سے بڑی نفرت تھی ، انہیں زبان ہلاتے دیکھ کر، اس کو بڑی کراہیت کا احساس ہوتا تھا۔۔۔ہاں مگر یہ تو کتیا ہے ۔۔مونث برادری کی ۔۔۔ توبہ!! بعد میں اسے پتہ چلا تھا کہ ثاقب کے منہ میں جو آتا ہے کہہ دیتا ہے مگر تب پیار کی اس رات اسے یہ مماثلت بھی بری نہیں لگی تھی۔۔۔

گزرتے دنوں کے ساتھ اسے پتہ چلا کہ وہ پیاری سی کتیا واقعی ہی میں پورے محلے کی جان تھی ۔نہ جانے کہاں سے آئی تھی مگر سب محلے والے اُسے ایسے پیار کرتے تھے جیسے ہر ایک کے گھر میں پیدا ہوئی ہو اور بس وہیں کی باسی ہو۔وہ تھی ہی بڑی پیاری سفید رنگ اور اوپر کالے کالے چھلیے دائرے۔اور صفائی کا تو اتنا خیال رکھتی کہ محلے کی مسجد کے مولوی صاحب بھی اسے ہاتھ لگا کر پیار کرتے تھا۔مسجد کے باہر جا کر بیٹھ جاتی تو آتے جاتے نمازی بھی اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر گزرتے تھے ،یعنی وہ ،اس محلے میں کسی انوکھی

لاڈلی کی طرح رہتی تھی۔اس کی حرکتیں دیکھ کر راحت کو نہ صرف اس سے خوف یا کراہیت آنا بند ہوگئی بلکہ وہ اسے بہت پیاری لگنے لگ گئی اسی لئے جب وہ ٹہلتے ہوئے ان کے صحن میں آنکلتی تو راحت بھی باقی گھروں کی طرح اس کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی تھی ۔بلاشبہ بلورانی کو دل جیت کا فن آتا تھا۔

بلورانی کا محلے والوں کو فائدہ بھی تھا۔آندھی یا زلزلے کی خبر محکمۂ موسمیات سے بھی پہلے وہ دیتی تھی اور اس کے ہوتے ہوئے محلے والوں کو باقی محلوں کی طرح چوکیدار نہیں رکھنا پڑتا تھا، اور ایسی وفادار تھی کہ کسی اجنبی کی کیا مجال جو اس محلے سے اس کی نظروں میں آئے بغیر گذر جائے اور کیا مجال کوئی فقیر یا چور اس محلے میں پھٹک بھی جائے۔

راحت کو وہ دن آج بھی یاد تھا جب بلورانی نے وکیل صاحب کے ہاں چوری ہونے سے بچائی تھی۔پورے محلے میں بلکہ دور دور کے سب محلوں میں اس کی وفاداری اور بہادری کی دھوم مچ گئی تھی۔جب وہ چور کی ٹانگ کو چمٹ گئی تھی اور چور نے اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے اس کے سر پر لاٹھی بھی ماری تھی، مگر وہ تھی کہ چمٹی ہی رہی تھی جب تک کہ سارا محلہ اکٹھا نہیں ہوگیا اور چور کو پولیس کے حوالے نہیں کر دیا گیا تھا۔ ۔۔صبح وکیل صاحب نے بلورانی کے گلے میں ایک خوبصورت چمکتا ہوا پٹہ انعام کے طور پر ڈالا تھا جس کے اوپر "بلورانی" لال رنگ سے کھدا ہوا تھا۔اسے پہن کر بلورانی کی چال میں غرور سا آ گیا تھا۔وہ پہلے بھی گلی کے آوارہ کتوں سے کنی کترائے رکھتی تھی اب تو بالکل ہی اپنے آپ کو ان سب سے الگ سمجھنے لگ گئی تھی، اس کی حرکتیں دیکھ کے صاف پتہ چلتا کہ بلورانی کو اپنی انفرادیت کا خوب احساس ہے۔

"تم تو اور لڑکیوں سے بہت مختلف ہو۔۔نہ نئے کپڑوں کی فرمائشیں نہ زیور، نہ محلے میں گھوم گھوم کر چغلیاں کرنے کی عادت۔۔راحت جان تم تو بڑے مزے کی چیز

ہو"۔۔شروع شروع میں جب ثاقب کو اس پر لاڈ آتا تھا تو یہی کلمات دہرا دیتا تھا۔

ہر وقت ہنسنے، مسکرانے والی، اپنے خلوص اور پیار کے ساتھ ہر ایک کے بھاگ بھاگ کر کام آنے والی راحت، "چیز" کہنے پر بڑے ناز سے تلملا اٹھتی تھی۔۔"منفرد ہوں اس لئے" چیز" نہیں ہوں پورا ایک فرد ہوں۔۔مجھے فرد تسلیم کیا جائے۔۔"

وہ جب بیاہ کر اس گھر اور محلے میں آئی تھی تبھی اسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ ان سب سے الگ ہے اور اس کی انفرادیت اس کے خلوص اور پیار میں تھی۔۔اس کی سہیلی نازو بھی یہی کہا کرتی تھی کہ تو تو بے وقوفی کی حد تک مخلص ہے، کبھی اپنا بھی سوچ لیا کر پاگل۔۔ سسرال والے نگل جائیں گے تجھے۔۔"

"لے!! پیار بھی کوئی نگلنے کی چیز ہے۔۔پاگل تو تُو ہے"۔۔وہ نازو کو پیار سے کہتی تھی۔

مگر جیسے جیسے دن گزر رہے تھے نازو کی بات سچ ثابت ہو رہی تھی، اس کا خلوص سسرالی رویوں نے نگل ہی لیا تھا اور ڈکار بھی نہیں مارا تھا۔اسے واقعی "چیز" ہی سمجھا گیا تھا پہلے جس بات کو وہ مذاق سمجھتی تھی ناقدری نے اسے احساس دلایا کہ پورے فسانے میں بات تو صرف وہی سچ تھی، اس آگاہی نے اسکے اندر ایک ضد سی پیدا کر دی۔۔اپنی ذات کو منوانے کی ضد۔اسے سمجھ نہ آتی تھی کہ کسی کے پاس بھی اسکے خلوص کی پہچان کیوں نہیں ہے، کیوں اسے بس ایسے ہی لے لیا گیا ہے جیسے وہ کچھ بھی نہیں، جیسے وہ کچھ بھی نہیں کرتی، جیسے اس کی محبت کی کوئی اوقات نہیں، جیسے وہ بس بے اوقاتی سی ہے۔کام کرنے میں اسے کوئی عار نہیں تھا، مگر صرف کام کرنے کی مشین بن جانے پر وہ تلملا اٹھی تھی۔اس گھر کے لئے یا اس گھر میں ہونے والے کسی بھی فیصلے سے اسے لاعلم رکھا جاتا تھا۔اسے صرف اتنی ہی بات بتائی جاتی جتنی ضرورت ہوتی۔یہ فلٹر اس کی ساس نے لگایا تھا یا شوہر نے، مگر اس تک فیصلے

اور باتیں ایسی ہی پہنچتیں جیسے کوئی خبر سنا دی گئی ہو۔ جیسے اس گھر سے اس کا تعلق فقط کام کرنے کی حد تک ہو۔ جب یہ احساس اس کے اندر جاگا تو اس نے شروع شروع میں کام کاج سے ہاتھ روک کے احتجاج کرنا شروع کیا مگر کسی پر کوئی اثر نہ ہوا، پھر اس کی ہنسی دکھ میں بدلنے لگی مگر کسی نے ذرا برابر بھی پروا نہیں کی۔ وہ بغیر کہے سب کے دکھ پڑھ لیتی تھی، اب اس کے دل میں ایک شکایت گھر کرنے لگ گئی تو یوں لگا جیسے دیواروں اور دروازوں نے بھی کان اور آنکھیں لپیٹ لی ہیں اور پھر کبھی کبھی وہ ثاقب سے کہہ ہی دیتی:

"کچھ کرنے سے پہلے کبھی مجھ سے بھی کچھ پوچھ لیا کرو، میں نے بی اے پاس کیا ہے، ابا کہتے تھے خاوند اپنی بیویوں سے مشورے کرتے ہیں اس لئے انہوں نے مجھے پڑھایا کہ میں تمھیں اچھے مشورے دے سکوں۔۔ مگر کس کام کی میری پڑھائی؟ تم تو مجھے کسی قابل ہی نہیں سمجھتے۔۔۔۔"

"تمھیں کیا مصیبت ہے، تنخواہ کی، گھر کے خرچے کی فکر کرنے کی، دیکھ!! اپنی مرضی سے کھانا پکاتی ہے نا؟ بچوں کے کپڑے اپنی مرضی سے لیتی ہے نا؟ تجھے ہے نہ پوری خود مختاری؟ تیرے کام میں کوئی بولتا ہے؟۔۔۔۔ وہ ایک دم ہی غصے سے چیخنے لگتا تھا۔ پہلے نہیں چیختا تھا، پہلے اسے بہلانے کی کوشش کرتا تھا یا کمرے سے چپ کر کے نکل جاتا تھا۔ مگر اب بات شروع ہوتے ہی چیخنے لگ جاتا تھا وہ اندر سے سہم سی جاتی تھی مگر اوپر اوپر سے بہادر بن کر کہتی رہتی تھی۔۔۔

"یہ تو کوئی ان پڑھ عورت بھی کر لیتی ہے، پھر ابے نے مجھے بی اے کیوں کروایا۔۔ پھر آپ نے بی اے پاس سے شادی کیوں کی۔؟

"مت ماری گئی تھی میری جو تیرے سے شادی کی اور مت ماری گئی تھی تیرے ابے کی جس نے تجھے بی اے کروایا، بی اے کروایا تھا تو کہیں منشی لگوا دیتا، میرے متھے تو نہ مارتا

۔ ہزار دفعہ بتایا ہے، پتہ نہیں تجھے کیا وہم ہو گیا ہے کہ تجھ سے باتیں چھپائی جاتی ہیں، مشورے نہیں لئے جاتے۔۔ کم عقلے! تجھ سے متعلقہ باتیں تجھے بتا دی جاتی ہیں، چھپایا کچھ نہیں جاتا بس جو تیرے مطلب کی باتیں نہیں، انہیں تجھے بتانے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔۔ کھوپڑی کھول اپنی، بی اے کی سند نے دل کے ساتھ ساتھ دماغ بھی چھوٹا کر دیا ہے۔۔"

اب وہ بولنے پر آتا تو چپ ہی نہیں کرتا تھا، چھوٹے دل کے طعنے پر وہ اتنی افسردہ ہو جاتی کہ بولنے کی بھی ہمت نہ باقی بچتی۔۔

پھر اسے لگتا سارا قصور اس کے ابے کا ہی ہے جس نے اسے فضول اتنا پڑھایا۔ یا اس کا اپنا ہے کیوں پڑھنے میں وقت اور ذہن خراب کیا۔۔ نہ پڑھتی نہ ایسے عجیب عجیب خیال ذہن میں آتے اور آرام سے جیسے ثاقب کہتا ہے "اور کیا چاہیئے"۔۔ میں خوش رہ لیتی۔۔"

مگر اب تو بی اے کی ڈگری نے اس کا خانہ خراب کیا ہوا تھا، کیسے اپنے آپ کو "چیز" سمجھ کر کونے میں دھرا رہنے دیتی، "فرد" ہونے کا احساس مارے دے رہا تھا۔۔ کم اہمیتی اور کم ہمتی نے اس کے اندر کمزور سی بغاوت کو جنم دے دیا تھا اور بستر میں اور کچن میں جہاں اس کی خود مختاری کا اعلان ہو چکا تھا، وہاں وہ اپنے فرائض سے سستی برتنے لگ گئی تھی۔۔ جیسے جنگ کے سب سے کمزور پیادے نے حکمت عملی سوچ لی ہو۔۔

"متعلقہ باتیں۔۔ کیا ہیں مجھ سے متعلقہ باتیں؟ بستر میں ہونے والی باتیں یا کچن کی؟ ہُم۔۔ ان سب کے لئے ابا نے پڑھایا تھا۔۔ یہ تو کام والی چھیمو مجھ سے بہتر جانتی ہو گی۔۔۔" جب کوئی نہ سنتا تو خود سے ہی بات کر لیتی۔

جنگی حکمت عملی کے تحت جب اس نے متعلقہ باتوں" سے بھی لاپرواہی اور سستی

برتنی شروع کر دی تو اب چیخنے کی باری ثاقب اور اس کی ماں کی تھی۔ جب وہ کام کی نہیں رہی تھی تو شکایت کا حق کھو بیٹھی تھی، اور اب انتقام لینے لگی تو گالی گلوچ کی مستحق قرار پائی۔

راحت اپنے ابا کی باتیں اور ارادے بھی بھولتی جا رہی تھی مگر پھر بھی اس کی آنکھوں کے آگے کبھی کبھی وہ منظر آ بستا جب ابا اماں کو باتوں باتوں میں اپنے کاروبار میں دلچسپی لینے پر مجبور کرتا رہتا تھا، "ادھر آ کر بیٹھ اللہ لوک دیکھ، سمجھ میں کیا کام کرتا ہوں۔ نفع کیسے ہوتا ہے اور نقصان کیسے ہوتا ہے۔ ادھر آ ذرا، بتا تو سہی اگر دکان میں چینی کی بوریوں کی جگہ آٹے کے تھیلے زیادہ ڈلوانے شروع کر دوں؟ کیا کہتی ہے؟" اور اتنی سی بات پوچھنے پر اماں کے گال خوشی سے لال ہو جاتے تھے۔ جیسے کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔

وہ اماں کو ایسا خوش ہوتا دیکھ کے حیرانگی سے پوچھتی تھی "اماں, ابا ایسے خشک حساب تجھے بتاتا ہے تو اتنی خوش کیوں ہوتی ہے"۔

"دیکھ راحتے! شادی کے شروع شروع کے دنوں میں جب تیرا ابا مجھے روز رات کو پھولوں کے گجرے پہناتا تھا تو مجھے لگتا تھا بس یہی دنیا ہے،، جب ہم اکٹھے ایک تھالی میں کھانا کھاتے تھے تو لگتا تھا میاں بیوی میں اس سے زیادہ کیا پیار ہو سکتا ہے۔ مگر جب آہستہ آہستہ تیرے ابے نے مجھے اپنی ہر چھوٹی بڑی بات کا راز دان بنا لیا اور ہر بات میں مجھ سے مشورہ کرنے لگ گیا تو مجھے احساس ہوا کہ اصلی ساتھ یہ نہیں کہ روز اس کے لائے ہوئے گجرے پہنوں یا اس کے ساتھ ایک تھالی میں کھانا کھاؤں، اصل ساتھ تو یہ ہے۔۔ بیوی ہونا کوئی بڑی بات نہیں، ساتھی ہونا ہی ساری بات۔۔ اور تیرے ابے نے مجھے بیوی نہیں ساتھی بنایا ہوا ہے اور اس" ساتھ" میں ہم دونوں جی خوش رہتے ہیں ساتھ کا یہ احساس، کبھی نہ ختم ہونے والی خوشی ہے "

تب اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا، وہ جمائیاں لیتی، اور یہ سوچتی رہی کہ، " توبہ ابے نے

دو جماعتیں پڑھی اماں کو بھی میری استانی جتنی باتیں سکھا دی ہیں"

تھوڑی بڑی ہوئی تو پتہ چلا ابے نے اماں کو باتیں ہی نہیں، اعتماد دے کر سلیقہ شعاری بھی سکھا دی تھی۔۔ اماں نے کئی رنگوں کے جوتوں کے ڈبے اکٹھے کر رکھے تھے، راحت سے ہر ڈبے پر علیحدہ علیحدہ نام لکھوا کے رکھے ہوئے تھے ۔۔ یہ سکول فیس کا ڈبہ، یہ گھر کے بلوں کا ڈبہ، یہ بشیر کے جوتوں کے لئے جوڑے ہوئے پیسوں کا ڈبہ۔۔ ایک دن اس نے اپنی کالج لیکچرر کو اماں کے اس طریقے کے بارے میں بتایا تھا تو وہ حیرت اور خوشی سے بولی" اللہ تمھاری اماں ہمارے ملک کی وزیرِ خزانہ بن جائیں تو ملک کو مہینوں میں منافع میں لے آئیں گی"۔

سب اسے استانی کا مذاق سمجھ کر ہنس پڑی تھیں۔۔۔

مہینے کے آخر میں ابا جب فخر سے سب بچوں کو بتاتے " دیکھو تمھاری ماں نے کیسی بچت کی ہے" تو اماں کے چہرے پر ایسے اعتماد کے رنگ بکھرتے جو شائد کسی ملک کے وزیرِ خزانہ کے چہرے پر اس وقت بھی نہ بکھرتے ہونگے جب وہ سالانہ ملکی بجٹ کو خسارے سے بچاتا ہوگا۔۔

" ثاقب، حسن کا داخلہ کروانے سے پہلے مجھ سے پوچھ تو لیتے کہ کس سکول میں کروانا ہے؟" بچوں کے معاملے میں بھی راحت نے جب خود کو بے اختیار پایا تو وہ رو ہی اٹھی۔

"یہ تمھیں کیا شوق ہے مفت کی مصیبتیں پالنے کا، میرے دوست نے بتایا تھا علاقے کا سب سے اچھا سکول ہے، فیس بھی ہمارے مطابق ہے، فیس کا حساب تو میں نے ہی دیکھنا ہے نا، تو تیرا کیا کام سر کھپانے کا؟ دوست کے بچے بھی وہیں پڑھتے ہیں اور اس کی بیوی وہاں کے معیار سے مطمئن ہے تو بس کروا دیا"۔۔۔ شوہر نے جیسے یہ لا پرواہی اپنے

بدن پر مستقل اوڑھ لی تھی۔۔

"اس کی بیوی مطمئن ہے، میں تو نہیں نا؟۔۔ مجھے تو پتہ چلے۔۔" اس نے آنکھوں میں آئے آنسو پی لئے، یہ سوچ کر کے کوئی دیکھ نہ لے۔ کیونکہ اب کوئی دیکھ بھی لیتا تھا تو کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اپنی بے حرمتی تو برداشت کر لیتی تھی، آنسوؤں کی نہیں برداشت ہوتی تھی۔۔۔

اس نے اس دن سے کسی کے بھی سامنے رونا چھوڑ دیا تھا، جب اس کی ساس نے اسے روتے دیکھ کر کہا تھا "ایسی ناشکری عورت میں نے زندگی بھر نہیں دیکھی، کُھلا کھانے کو ہے، کوئی پوچھنے والا نہیں، کوئی روک ٹوک نہیں، مرضی سے سوتی اٹھتی، پھر بھی جب دیکھو رونا دھونا مچایا ہوتا۔۔ بی بی اس گھر میں نحوست نہ پھیلاؤ"۔۔۔ تب سے اس نے آنسوؤں کے سرعام بہنے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔۔

"ارے اماں تم ہی کھانا بھجوا دو، یہ تو کان ہی کھائے گی بس۔۔ لیکن ٹھہرو میں خود ہی باہر آجاتا ہوں"۔۔۔ ثاقب کمرے سے نکل گیا کیونکہ جانتا تھا اب راحت کا منہ پھولا رہے گا۔۔" کون اسے منانے میں وقت برباد کرے اور منانے کے بعد بھی بے سوادی سی، چوبیس گھنٹے کی بک بک، عورت ذات ہے ہی ناشکری"۔۔

ثاقب اور اس کی ماں ٹھیک ہی کہتے تھے، "نا کوئی دکھ، نہ غم۔۔ بڑی ناشکری ہوں میں۔۔"

باہر بلو رانی شور مچا رہی تھی۔ لگتا پھر کسی نے اسے مارا ہے چیاؤں چیاؤں کی آواز سے وہ خیالوں سے چونکی۔۔۔

اس نے دروازے سے باہر نکل کر محلے کے ایک بچے کو آواز دی، کیا ہوا بلو رانی کو کیوں رو رہی ہے۔۔۔

"رو رہی ہے؟ بچے نے حیرت سے اسے دیکھا۔۔

آپا، وہ بھونک رہی ہے۔ اب تو ہر وقت بھونکتی ہی رہتی ہے۔ ابا کہہ رہا تھا کسی کام کاج کی نہیں رہی۔۔" بچے نے اپنے ابے کی آواز کی ہو بہو نقل کی۔۔

"دیکھ مٹھو کوئی ایسے ہی نہیں بھونکتا اور بلو رانی کیوں ایسے بھونکے گی کچھ تو ہوا ہوگا۔۔ "راحت کو جیسے بلو رانی کے دل کی بات پتہ تھی.

"جا اسے پکڑ کے لا، میں اسے کچھ کھلا دوں۔۔" راحت نے بچے کو پیار سے پچکارتے ہوئے کہا۔۔

"نہ آپا نہ۔۔ اسے اب کوئی نہیں ہاتھ لگاتا, بھونکتی ہے یا کاٹنے کو پڑتی ہے، پہلے نکمی ہوئی تھی اور اب پاگل بھی ہوگئی ہے۔۔"

"کیا نکمی ہوگئی ہے مٹھو ایسے نہیں کہتے۔۔۔" راحت نہ جانے کیوں بلو رانی کا کیس ایک چھوٹے سے بچے کے سامنے لڑ رہی تھی۔

"آپا کل شیخ صاحب کے گھر چوری ہوگئی ہے اور یہ بلو رانی، مہارانی بنی گھومتی رہی، ابا کہہ رہا تھا اب یہ چوروں کے لئے نہیں محلے والوں کے لئے خطرہ بن گئی ہے. پتہ ہے آپا، سب ادھر ہی آپ کے گھر کے سامنے والے خالی میدان میں اکٹھے ہو رہے ہیں، پنچائیت لگنے لگی ہے، وہاں فیصلہ ہونا ہے کہ اس کا کیا کیا جائے، خود زہر دے دیں اس سے پہلے کہ کسی کو کاٹ کھائے یا میونسپلٹی والوں کو بلا کر اسے بھی اس کے بچوں کی طرح اٹھوا دیا جائے۔۔ ابا کہہ رہا تھا ہو سکتا ہے اس طرح اپنے بچوں کے پاس ہی پہنچ جائے۔۔" بچے نے بڑے رازدارانہ انداز سے پنچائیت میں ہونے والی ممکنہ باتوں اور فیصلوں سے اسے آگاہ کیا۔

"زہر کیوں؟ وہ کانپ کے رہ گئی۔

"ارے آپ کو نہیں پتہ پرسوں مسجد میں گھس گئی تھی اور اسکی وجہ سے ساری نماز

خراب ہوگئی تھی۔ ابا کہہ رہا تھا "نمازیوں کا تو خدا ہی ناراض کر دیا اس نے ۔۔" بچے نے پھر اپنے ابے کی نقل کی۔

"دیکھ مٹھو کسی کا خدا خراب نہیں ہوتا، کتنے بھلے کئے ہیں بلو رانی نے سب کے۔۔ کیا سب بھول گئے؟ ۔۔۔ راحت کی آواز میں ویسی ہی جانی پہچانی تلخی گھل گئی جیسے شروع شروع میں وہ ثاقب کے سامنے اپنے فائدے گنواتی تھی تو اس کے لہجے میں آ جاتی تھی۔

" آپا ابھی سب اکٹھے ہونے لگے ہیں تو آپ خود ہی سن لینا، میں تو چلا ابھی ککو نے دس سکور کئے ہیں، میں نے اسے گیارہ کر کے ہرا دینا ہے"۔ بچہ کہتے ہوئے بھاگنے لگا تو راحت نے جھپٹ کر اس کا بازو پکڑ لیا:

" بات سن، مٹھو تجھے یاد ہے نا، بلو رانی تمھارا گیند کہاں کہاں سے پکڑ کے لاتی تھی۔۔ ایک دفعہ تمھارا گیند چوہدری صاحب کی گلاب کی جھاڑی میں پھنس گیا تھا، کانٹے چبھنے اور کیڑوں کے ڈر سے کوئی بچہ اس گھنی جھاڑی میں نہیں جا رہا تھا، کون گیند لایا تھا؟ کچھ یاد ہے؟ مٹھو سر جھکائے کھڑا رہا جیسے پنچائیت کے فیصلوں کا ذمہ دار وہ بھی ہوگا۔

"بلو رانی نکال کے لائی تھی اور سارا پنجہ اس کا زخمی ہو گیا تھا، یاد ہے کہ نہیں؟ راحت نے مٹھو کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر کیا۔۔

"ہاں آپا تب بڑے کام کی تھی، مگر اب تو ۔۔۔" مٹھو نے راحت سے آنکھیں چراتے ہوئے کمزور سی آواز میں کہا۔

"مٹھو وہ کام کی نہیں رہ گئی مگر جو اچھے اور مشکل کام اس نے سب کے لئے کئے ہیں وہ تو کوئی یاد رکھ لے۔ اور مٹھو کوئی یہ بھی تو سوچے کہ وہ کام کی کیوں نہیں رہ گئی؟ اسے کیا روگ لگ گیا ہے؟ ۔ ابے سے کہنا یہ باتیں بھی پنچائیت میں کرے، شائد پھر بلو رانی کو زہر نہ دیں۔۔ شائد ۔۔۔ کہے گا اپنے ابے سے؟ راحت نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے

کہا۔۔ کہے گا؟"

"اچھا آپا جی ۔۔ ویسے روگ کیا؟ ابا کہہ رہا تھا ہڈ حرام ہوگئی ہے اور بس، روگ کیا آپا جی؟

راحت خاموشی سے مٹھو کو دیکھتی رہی، اس کی نظروں سے گھبرا کر وہ بول اٹھا۔۔ اچھا! کہہ دوں گا۔۔

مٹھو چلا گیا اور وہ وہیں کھڑی رہ گئی اور پھر اچانک رات کو ثاقب سے ہونے والی لڑائی کا منظر ایک دم سے آنکھوں میں چھم کر کے اتر آیا،

"تم سے تو بات کرنا مشکل ہو گیا ہے، جب سے اماں دنیا سے گئی ہیں، تیری تو زبان ہی باہر آ گئی ہے۔" ثاقب نے غصے سے گلاس زمین پر دے مارا تھا۔

"یہی میں کہہ رہی ہوں جب سے اماں دنیا سے گئی ہے آپ کا گھر آنے جانے کا کوئی وقت ہی مقرر نہیں رہا، دیر سے آتے ہیں اور آ کر بھی جیسے نہیں آتے، ٹی وی لگا لیتے ہیں اور میں سارا دن بچوں کے ساتھ لگی رہتی ہوں، میرا بھی دل کرتا ہے کوئی مجھ سے بات کرے۔ میرا حال پوچھے۔" رات بہت دنوں بعد اس نے ہمت کر کے پھر سے اپنے لئے کوئی آواز اٹھائی تھی مگر نتیجہ وہی نکلا،

"ہوگئی شروع پھر سے مظلومیت کی کہانی ۔۔ بات سنو! گھر کے کاموں کے لئے چھیمو ہے، ایک بچوں کو ہی دیکھنا ہوتا ہے نا، اس کی بھی شکائت کر رہی ہو؟ ۔۔ اور کیا چاہیئے تمھیں ناشکری عورت ۔۔ خوش رہنا نہیں آتا؟ تم جیسی کم ظرف عورتیں کبھی خوش نہیں رہ سکتیں ۔۔ بس کوئی نہ کوئی رونا" ۔۔۔

"میں بچوں کے خیال رکھنے کی شکایت نہیں لگا رہی میں تو کہہ رہی ہوں میں ۔۔۔"

"بس!! چُپ.. ایک آواز نہ نکلے، تھکا ہارا انسان گھر آتا ہے، سکون کے لئے، وہ تو تم

سے اب ملتا نہیں ،تو کم از کم زبان ہی منہ کے اندر رکھنی سیکھ لو، کچھ تو احسانوں کا بدلہ دے دو۔۔۔"

احسان کا لفظ سن کر راحت کا حساس دل ٹوٹ سا گیا اور اس نے سوچا اسے چپ ہی رہنا چاہیئے تھا کیونکہ اب وہ آرام سے بھی بات پوچھنے کا حق کھو بیٹھی تھی، سنا نہیں تھا شوہر کیا کہہ رہا تھا کہ اب وہ سکون بھی نہیں دے سکتی اور جب بیوی سکون دینے کے قابل نہ رہ جائے تو کچھ بھی پوچھنے کا اختیار کھو بیٹھتی ہے یہ بات اسے پہلے سمجھ نہیں آ رہی تھی، اب وہ سمجھ چکی تھی۔ جب ثاقب ضد کر کے اب اس سے کچھ نہیں منواتا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے تو اسے بھی صبر شکر کر کے خاموشی سے اِسی زندگی میں خوشی ڈھونڈ لینی چاہیئے۔

"بڑی ہی ناشکری ہوں میں"۔۔ثاقب ٹھیک کرتا ہے، میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی گالیاں دینی شروع کر دیتا ہے، میں اب اس کے کس کام کی؟

"میں نے تو۔۔۔۔۔۔۔۔راحت نے بات کو ختم کرنے کے لئے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ اس کے حلق میں ہی ٹوٹ گئے کیونکہ ثاقب غصے سے اسے دھکا مارتا ہوا باہر جا کر صوفے پر لیٹ گیا تھا۔

کچھ روز پہلے اسے اپنے ناشکرے پن کی آخری گواہی بھی مل گئی تھی جب ہر طرف سے دروازے بند ہو گئے تو اس نے اپنی بڑی بہن کو اپنے کرب میں شریک کرنے کی کوشش کی تھی۔۔"باجی پتہ نہیں ثاقب کو کیا ہو گیا، پہلے بات سنتا نہیں تھا، اب کرنے بھی نہیں دیتا۔۔۔میں کیا کروں"؟

"شاباشے یہ کون سی ایسی بات ہے؟ خالہ صغریٰ کی لڑکی یاد ہے، اس کا شوہر جوئے میں سب لٹا بیٹھا تھا، در در کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے، اپنے محلے کی کلثوم یاد ہے؟ جس کا شوہر ہر ہفتے کی رات شراب پی کر اس کی پٹائی لگاتا تھا؟ اور میرا حال پتہ ہے نا؟ کتنا گندا

سسرال ملا ہوا ہے، بات بات پر روک ٹوک ہے مجھے۔۔تجھے کیا ہے؟ سب کچھ تو ہے تمھارے پاس۔۔عیش کر رہی ہو عیش، پھر بھی ناشکری، بس تمھیں تو رونے دھونے کے سوا کچھ آتا ہی نہیں"۔اس کی بہن نے بات پوری سنے بغیر اسے لتاڑ کر رکھ دیا تھا۔۔

" مگر میں نے تو آج زندگی میں پہلی دفعہ آپ سے کوئی ایسی بات کی ہے، میں نے کب شکوے کیئے ہیں"۔۔۔اس نے حیران ہو کے پوچھا تھا۔

ابا کو نہیں بتاتی رہتی کہ وہ کچھ سمجھتا نہیں، مشورہ نہیں کرتا، بتاتا نہیں، تیرا کیا خیال ہے ابا ہمیں نہیں بتاتے؟ تیرے جانے کے بعد ابا بھی یہی کہتے ہیں کہ اس لڑکی کو بی اے کیا کروا دیا، اسے تو خوش رہنا ہی بھول گیا۔۔"

"یہ ابا کہتے ہیں؟اس نے بے یقینی سے بہن کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں، میں اپنے پاس سے لگا رہی ہوں، ابا ہی کہتے ہیں اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں، بس اب میرا منہ نہ کھلوا اور بلا وجہ کا مظلوم بننا چھوڑ دو اور خوش رہنا سیکھو، دال میں ہر وقت کالا کالا نہ دیکھا کرو۔ابا کو میرے مسائل حل کرنے دو جو واقعی بڑے سنگین ہیں، اپنی فضول کی اور بے کار کی باتوں میں انہیں مت الجھائے رکھا کرو، اور خدا کے واسطے شکر کرنا سیکھو۔۔" بہن نے آواز میں تھوڑی سی نرمی بڑی مشکل سے شامل کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں بہت خوش ہوں باجی شکر ہے اللہ کا میں تو بس یونہی ایک بات۔۔ ۔"۔اب وہ دروازے کے پاس کھڑی سوچ رہی تھی ناحق اپنے الفاظ باجی پر ضائع کیے تھے۔کوئی دکھ نہ سمجھے تو یہ اس بھی بڑا دکھ ہوتا ہے۔انسان کو سمجھنے کے سب دروازے بند ہو جائیں، تو وہ احتجاج کرنا چھوڑ دیتا ہے۔احتجاج کرنا چھوڑ دے تو کیسی سستی جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

" یہ بلو رانی بڑی ہی ہڈ حرام ہو گئی ہے، محلے میں چوریاں ہونا شروع ہو گئی ہیں کیا

فائدہ اس کم بخت کا"۔۔سامنے کی گراؤنڈ میں پنچائیت بیٹھ چکی تھی اور شیخ صاحب کی آواز گونج رہی تھی۔۔

"پندرہ لوگوں کی چائے بنا کر بھجوا دینا۔۔اسی وقت ثاقب نے اندر آ کر اسے کہا اور تم کیا دروازے کے ساتھ چمٹی کھڑی ہو؟

"وہ بلو رانی کو کیا کریں گے؟ اس نے ثاقب کی جھڑک کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"بلو رانی کی تقدیر کا فیصلہ ہونے والا ہے آج اور کیا ہونا ہے؟ ثاقب تھوڑا نرمی سے بولا۔

اس کی نرمی کو دیکھتے ہوئے وہ جھٹ سے بولی:

"آپ جو بھی بات کریں یاد رکھیں کہ وہ بہت بڑے دکھ سے گذری ہے۔میونسپل والے جب تک اس کے بچے اٹھا نہیں لے گئے تھے وہ بڑی وفاداری اور محبت سے سب کا خیال رکھتی رہی ہے۔۔یاد رکھئے گا یہ۔۔۔خیال رکھئے گا کوئی نا انصافی ، کوئی ظلم نہ ہوجائے۔۔۔"الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے اور ثاقب حسبِ معمول اس کی بات سنے بغیر دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔۔۔

"یاد رکھئے گا ۔۔۔۔وہ بہت وفادار اور محبت کرنے والی تھی ۔۔۔ وہ ، وہ ۔۔۔اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔جیسے وہ ثاقب کے ساتھ پہلے کی طرح اپنے لئے بحث کرتی تھی اور وہ ایسے ہی اس کی بات سنے بغیر یا سوجاتا تھا یا کمرے سے نکل جاتا تھا۔۔وہی شناسا سا آنسو کا گولہ گلے میں آ اٹکا۔۔

ادھر بلو رانی کا مقدمہ جاری تھا۔وکیل صاحب نے دفتر سے آ کر اپنا کالا کوٹ بھی نہیں اتارا تھا کیونکہ باقی محلے کے لوگ ان کی بات کو کالے کوٹ کی وجہ سے زیادہ اہمیت

دیتے تھے۔شیخ صاحب کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے انتہائی غصے سے بول پڑے:

محلے میں چوریاں ہو رہی ہیں ، یہ ہڈحرام منہ بسورے پڑی رہتی ہے ، بلاؤ تو آگے سے بھونکتی ہے ، سزا کے طور پر سب گھروں نے گوشت بند کیا تو قصائی کے پھٹے کے نیچے جا گھستی ہے ، اس کے گاہکوں پر بھونک کر اس کی بھی گاہکی خراب کرتی ہے ، اس نے بھگایا تو غضب خدا کا مولوی صاحب کی ٹانگ کو کاٹ کھایا۔۔"

"مولوی صاحب کی؟ استغفراللہ"۔۔حیرت سے بھری بہت سی آوازیں منمنانے لگیں۔۔

شیخ صاحب کے گھر کی چوری کا تو سب کو پتہ تھا مگر شائد یہ مولوی صاحب والا حادثہ حال ہی میں ہوا تھا اور کسی کو نہیں پتہ تھا۔۔۔

اب دکاندار وکیل صاحب کے خاموش ہوتے ہی بولا:

"ایسی احسان فراموش اور ناشکری نکلی اس کے لئے سب کے گھروں کے دروازے کھلے تھے ، کسی نے اسے گلی کا آوارہ جانور نہیں سمجھا۔۔سب گھر کا پکا ہوا گوشت اسے دیتے تھے ، اپنے بچوں کا دودھ اس کے لئے بھی رکھا جاتا تھا۔کیا کیا چاہ نہیں کئے ۔۔گلی کے دوسرے آوارہ کتوں کی بجائے ، محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلتی تھی۔۔اتنی عزت ملی ہوئی تھی لیکن بڑے بوڑھے درست فرماتے ہیں کہ عزت اور خوشی ہلکی ذات کو راس نہیں۔۔آخر کو ذات کی کتیا ہی ہے نا۔یہی کرنا تھا اس نے۔۔کاٹ کھایا مولوی صاحب کو۔۔۔"

"ہائے او ربا مولوی صاحب کو کاٹنے والا جرم بہت بڑا۔ اب نہ بچی بلو رانی "راحت کے دل کو دھکے سے لگ رہے تھے۔

بلو رانی کے گلے میں پڑے پٹے کے ساتھ ایک لمبی سی رسی جوڑ کر اس کا دوسرا سرا اسی میدان میں ایک ٹنڈ منڈ درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔تا کہ وہ ادھر اُدھر نہ بھاگے

اور اپنے کیس کی ساعت اور فیصلہ پوری یکسوئی سے سنے۔

راحت بلو رانی کو اس حال میں دیکھ کر جیسے اپنے ہی حواس کھو رہی تھی اور بلو رانی مقدمے سے ایسے لاتعلق سی بیٹھی تھی جیسے اسے پہلے سے معلوم ہو کہ کیا ہونے والا ہے، جیسے اسے کسی سے بھی اچھائی کی امید باقی نہ رہ گئی ہو، جیسے اس کی سب امیدیں سب لوگوں سے ختم ہو چکی ہوں او وہ بس خاموش سی بیٹھی ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی جب سے اس کے نومولود کتوروں کو میونسپلٹی کا ٹرک اٹھالے گیا تھا اس دن کے بعد سے بلو رانی کی گردن اور آنکھیں بس تیز تیز ادھر اُدھر گھومتی رہتی تھیں۔۔

راحت کی آنکھوں میں اس صبح کا منظر آکر بیٹھ گیا جب بلو رانی کی فلک شگاف چیخوں سے پورا محلہ جاگ گیا تھا۔ پتہ چلا کہ رات کے کسی پہر میونسپلٹی والے اس کے بچوں کو ٹرک میں لاد کر لے گئے تھے۔ بلو رانی ذرا پرے ہٹ کر سوئی ہوئی تھی، اٹھی تو اس کی دنیا لٹ چکی تھی۔ بلو رانی بچ گئی تھی مگر راحت اپنی ڈیوڑھی میں دروازے کے پیچھے کھڑی بلو رانی کی گمشدگی کے ایک ایک مرحلے کو یاد کر رہی تھی،

پہلے سب کو لگا جیسے بلو رانی کی مت ماری گئی ہے کیونکہ اب وہ کبھی وکیل صاحب کا کالا کوٹ پکڑ کر انہیں تکتی رہتی تھی، کبھی مولوی صاحب کے پاک سفید جبے کو منہ میں دبا لیتی تھی، سوچتی محلے کے یہ معززین اس کے بچے واپس دلا دیں گے مگر جب وہ اس کی خاموش آنکھوں کا مطلب سمجھے بغیر اسے جھٹک کر اپنے کاموں کاجوں کو چلے جاتے، تو بلو رانی کو لگا کہ دکھ شائد بول کر کہنے پڑتے ہیں، خامشی کو کوئی نہیں سمجھتا، تو وہ جو بڑی سمجھدار مشہور تھی، سوائے فقیروں اور چوروں کے کسی پر نہ بھونکتی تھی، اب آتے جاتے محلے والوں پر بھونکنے لگی تھی۔ راحت کو یاد تھا کہ اسے بھونکنے سے چپ کروانے کے لئے کبھی کوئی لات اور کبھی کوئی پتھر مار دیتا تھا۔ اُسے چوٹ لگتی تو وہ اور کربناک طریقے سے چیختی تھی ۔۔

بہت عرصے تک اس کی چیخوں میں کرب شامل رہا مگر پھر چوٹیں کھا کھا کے اس کی چیخوں میں تشدد کا عنصر آ گیا۔

پڑھے لکھوں کے اس محلے میں بلو رانی کے دکھ کے سب ان پڑھ رہے پہلے وہ اپنے دفاع میں آنکھوں میں آنسو بھر کر بھاگ جاتی تھی، اب وہ اپنے دفاع میں حملہ کرنے لگ گئی تھی اور اب محلے والے اس سے خوفزدہ رہنے لگ گئے تھے او پھر جب اسے مڑ کر حملہ بھی کرتے دیکھا تو پتھر اور لات سے بھی پرہیز کرنے لگ گئے۔

پھر راحت کو یاد تھا کیسے محلے میں چوریاں بڑھنے لگ گئی تھیں مگر بلو رانی سب سے بے پرواہ، سست سی، ایک کونے میں پڑی رہتی تھی لیکن جس کے بھی گھر چوری ہوتی وہی اس کو گالیاں دیتا تھا اور سزا کے طور پر اس کا کھانا بھی بند کر دیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ محلے والے اس کی وفاداری، محبت، سمجھداری سب بھول گئے تھے، اب ہر کسی کو بلو رانی کی برائیاں نظر آرہی تھیں اور اس پر کی گئیں اپنی اچھائیاں بہت بڑی ہو ہو کے نظر آنے لگی تھیں اور گذرتے دنوں کے ساتھ بلو رانی کے اندر اس کے کھوئے ہوئے بچوں کا دکھ ٹھہر سا گیا تھا۔

جرم تو اس کے بہت بڑے تھے۔۔ ناشکری کا، مت ماری جانے کا، کسی کام کی نہ رہنے کا اور پھر ہر وقت ناحق بھونکتے رہنے کا۔۔

راحت نے مٹھو کے ابے کی طرف دیکھا شائد مٹھو کے کہنے پر وہی بلو رانی کے احسانات یاد کروا دے مگر شائد مٹھو بھی اپنے ابے کو بتانا بھول گیا تھا۔۔ اس لئے کرسیوں سے صرف وہ احسانات یاد کروانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں جو اس کتیا پر انسانوں کے تھے
۔

چھوٹے بیٹے کے رونے کی آواز سن کر اسے، فیصلہ سننے سے پہلے ہی دروازے سے کان ہٹانے پڑ گئے۔۔

ثاقب کمرے میں داخل ہوا تو چھوٹا تو دوبارہ سے سو چکا تھا مگر وہ نیند اور رونے کی وجہ سے سرخ ہوئی آنکھوں کے ساتھ ثاقب کا ہی انتظار کر رہی تھی ۔۔" کیا ہوا فیصلہ؟ اس نے مردہ سی آواز سے پوچھا۔۔ بلورانی کو زہر تو نہیں۔۔۔۔۔۔؟"

"نہیں بابا اتنا سنگدل کون ہوتا ہے۔۔ فی الحال یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جتنا بھی بھونکے، بس اس کو توجہ ہی نہ دو۔ مولوی صاحب کو پیٹ میں چودہ ٹیکے لگے ہیں مگر پھر بھی انہوں نے پیغام بھجوایا تھا کہ بلورانی کو اتنا کھانا جتنا زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے ڈالتے رہیں، ہوسکتا ہے وقت گذرنے کے ساتھ اپنا دکھ بھول کر نارمل ہو جائے اور پہلے کی طرح فائدہ مند ہو جائے ۔۔ چھ، آٹھ مہینے دیکھیں گے اس کے بعد بھی ٹھیک نہ ہوئی تو پھر دیکھا جائے گا۔۔۔"

"بڑی رحم دلی کی سب نے" ۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی راحت کے حلق میں کڑواہٹ گھل گئی۔۔۔

"وکیل صاحب نے کہا ہے کہ انتہائی قدم لینے کی کیا ضرورت ہے، نکمی، کم عقل اور چڑچڑی کتیا ذات سب کی توجہ کی ایسی عادی ہو چکی ہے جب وہی نہیں ملے گی تو خود ہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔ ناشکرا پن کرنے اور وقت بے وقت بھونکنے والوں کا یہی علاج ہوتا ہے، پڑا رہنے دو کم بخت کو کونے کھدرے میں، انہوں نے کہا ہے کہ بھونکے تو جواب میں پتھر نہ مارو، اور اس طرف دیکھنا بھی چھوڑ دو جدھر کم بخت پڑی ہو، ایسے سانپ بھی مر جاتا ہے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی اور شکر ہے سب محلے والوں نے اس فیصلے سے اتفاق کر لیا۔"

ثاقب نے الفاظ چبا چبا کر ایسے فخر اور اطمینان سے ادا کئے کہ جیسے اُس کے کئے گئے کسی سابقہ فیصلے پر محلے کے معززین نے بھی رضامندی کی مہر ثبت کر دی ہو۔۔۔۔

وہ دردیں

سال پہلے وہ درد اس کے پیٹ کے نیچے والے حصے میں اترا تھا تو اس کے لئے اجنبی تھا، آج وہ اسے اچھی طرح سے پہچانتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ درد دنیا کا سب بڑا درد ہے، جب آتا ہے تو لگتا ہے جان ساتھ لے کر ہی جائے گا مگر جب جاتا ہے تو ایک ننھی سی جان آپکی گود میں ڈال کر آپ کو دنیا کا سب سے بڑا تخلیق کار بنا جاتا ہے۔ مگر درد سے یہ آشنائی اسے پچھلے سال سے زیادہ خوفزدہ کر رہی تھی۔ کیونکہ اس وقت وہ اس درد سے کبھی نہیں گزری تھی، اور نڈر تھی۔ اسکی ماں کئی سال پہلے ہی اسے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ماں کے محبت بھرے ساتھ کی وجہ سے جو لڑکیوں کے اندر بڑے سے بڑا درد سہنے کی طاقت موجود رہتی ہے، وہ اس سے محروم تھی۔ اور ماؤں کی حفاظتی فطرت کی وجہ سے جو لڑکیوں میں نزاکت ہوتی ہے وہ اس سے بھی محروم تھی۔ اس کی زندگی میں مامتا کی عدم موجودگی نے جو غصے میں بھری مضبوطی اسے عطا کی ہوئی تھی وہی اس کے کام آتی تھی۔

مگر اب کے برس بات دوسری تھی۔ سال پہلے والا بچہ اب اسکے کلیجے کا ٹکڑا بن چکا تھا۔ موت جو اس کی سہیلی تھی، جس سے وہ گھنٹوں باتیں کرتی تھی اب اس کے پاس سے بھی گذر جاتی تو وہ پہروں کانپتی رہتی تھی۔ ننھے سے بیٹے میں اس کی جان اٹک کے رہ گئی تھی۔ وہ ہنستا تو وہ ہنستی، وہ روتا تو وہ بھی رونے لگ جاتی تھی۔ دیکھنے والے مذاق اڑاتے کہ بچے تو روتے ہی رہتے ہیں کوئی ان کے رونے سے ایسے بھی روتا ہے۔ مگر وہ ایسے ہی روتی تھی، اس کا بیٹا اس کی زندگی کا پیار بھی تھا، اور زندگی سے پیار کرنے کی وجہ بھی۔

آج سال بھر کے بعد ہی جب وہ دوبارہ اسی درد سے گزر رہی تھی، تو کانپ رہی تھی۔ نو مہینے پورے ہونے سے پہلے ہی اس کا بچہ پیدا ہو جاتا تھا۔ پہلے بچے کی دفعہ بھی جب اس کی پڑوسن نے اسے پیٹ پکڑے درد سے دوہرا ہوتے دیکھا تو کہا تھا "ہسپتال جاؤ تمھارا بچہ ہونے والا ہے" اس وقت کے انتظار میں نجانے وہ کب سے ایک ایک دن گن رہی تھی۔ مگر ڈاکٹر نے تو صبح ہی اسے بتایا تھا کہ ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ تو اس نے پڑوسن سے بھی کہا تھا کہ "ابھی وقت ہے"۔

لیکن اس کی پڑوسن نے اسے ضد کر کے ہسپتال بھجوا دیا تھا۔ پہلے بچے کی خوشی اس پر ایسے طاری تھی کہ اسے آنیوالے وقت سے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ وہ تو وہاں ہسپتال میں کسی عورت کو اس دردِ زہ سے چیختے چلاتے دیکھتی تو اس کی ہنسی نکل جاتی تھی۔ اور چیخیں مارتی عورتوں کو دیکھ کر اس نے دل دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ دردیں جتنی بھی تیز ہو جائیں وہ ہرگز نہ چیخے گی۔

اسے اندازہ تھا کہ سال پہلے کئے گئے عزم کو نبھانا آج کس قدر مشکل لگ رہا ہے۔ وہ مخصوص درد پسلیوں میں جب تک رہتا ہے عورت نہ جیتی ہے نہ مرتی ہے۔ کہا جاتا ہے قبر کا منہ بھی کھل جاتا ہے اگر اس لمحے کوئی عورت سے پوچھ لے قبر کا منہ کھلا ہے وہاں تک چلنا پسند کریں گی یا یہی درد دیں سہیں گی تو ہر عورت بلا جھجک قبر کا انتخاب کرے گی۔۔ مگر وہ بے درد دردیں اس وقت تک جان نہیں چھوڑتیں جب تک بچہ پلیسنٹا میں پلسیٹا مارے بیٹھا رہتا ہے۔ ادھر بچے اور ماں کا ناڑو کٹا ادھر وہ بھی جھٹ سے غائب۔۔

جولائی کے اس حبس زدہ موسم میں پرائیویٹ ہسپتال کا پرسکون اور ٹھنڈا ماحول اسے سکون نہیں پہنچا رہا تھا۔ اس کے ساتھ آئی محلے کی ایک خالہ بار بار اس کے پسینے میں ڈوبے ہوئے ماتھے کو اپنے ہاتھ میں پکڑے چھوٹے سے سفید تولیے کے ساتھ صاف کرتی تھی، جو انہوں نے ہسپتال آتے ہوئے، جب ان کی گاڑی لال بتی پر کھڑی تھی تو ایک

چھوٹے سے بچے سے ازراہِ ہمدردی لے لیا تھا، جو سگنل پر کھڑی گاڑیوں کے پاس بھاگ بھاگ کر جاتا تھا، اس نے درد کے وقفے میں سوچا تھا، ہائے یہ بچہ ایک تولیہ بیچنے کے لیے بھاگ رہا ہے، تو اس نے اپنے شوہر کو کہا تھا کہ " جلدی سے لے لو اس سے پہلے کہ گاڑی چل پڑے، اور بچے کی آنکھوں میں مایوسی پھیل جائے"۔ اب وہی تولیہ اس کے ماتھے سے درد کی شدت سے ابھرنے والا پسینہ صاف کر رہا تھا اور شائد وہ بچہ اب تک تمام تولئے بیچ کر ان پیسوں سے کہیں سے دال روٹی کھا رہا ہو گا۔۔ اس حالت میں بھی اس غریب اور لاچار بچے کے خیال نے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر دیں۔

اس کی ہمسائی خالہ نے جو دنیا داری نبھانے کو اس کے ساتھ ہسپتال آ گئی تھی، پسینے کے ساتھ ساتھ اس کے آنسو بھی صاف کئے اور کہنے لگی:

" حلیمہ مجھے پتہ ہے تمھیں اپنی امی یاد آ رہی ہونگی۔۔ ایسے وقت میں لڑکیوں کو ماں کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔۔"

" نہیں خالہ، مجھے درد یاد آ رہا ہے، پچھلے سال پہلی دفعہ تھی نا کچھ پتہ نہیں تھا۔ اب تو پکا پکا پتہ ہے کہ آگے کیا کیا ہونا ہے بس اسی ڈر سے رونا آ رہا ہے۔۔۔" اس نے تولیہ بیچتے انجان بچے کے درد کو پیٹ کے درد میں ہی کہیں دبا لیا۔۔

ہسپتال میں سفید کوٹوں میں ملبوس نرسیں اور جونیئر ڈاکٹرز ادھر سے اُدھر آ جا رہی تھیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر حلیمہ کا دم گھٹتا تھا۔ جب انہوں نے اسے لیٹ جانے کو کہا تو وہ سہم گئی، جانتی تھی اب درد تیز اور اوران کا دورانیہ طویل ہونے والا ہے۔ جونیئر ڈاکٹر نے ساتھ لگی درد ناپنے والی مشین کو دیکھتے ہوئے دوسری ڈاکٹر کو کہا:

" واہ دیکھو اس کی pains کتنی آئیڈیل ہیں۔ جتنے وقت بعد آنی چاہیں اور کتنی دیر ٹھہرنی چاہئیں اس کا بالکل ٹھیک حساب ہے"۔ وہ دونوں اس کی دردوں پر پُرمغز تعلیمی گفتگو کرتی اور اسے سراہتی رہیں اور وہ سوچتی رہی..

"جس درد سے اس کی جان نکلے جارہی ہے، وہ انکے لئے اطمینان کا باعث ہے کیونکہ جو کچھ انہوں نے گائنی کی کتابوں میں پڑھا ہے اس کی دردیں عین اس کے مطابق ہیں۔۔۔شکر ہے ان کے آلات میں انسانی روح کے درد کا کوئی گراف نہیں اُبھرتا ورنہ انہیں اندازہ ہو جاتا کہ میرے درد کے گراف میں کوئی وقفہ نہیں اور نہ ہی کوئی نشیب ہے وہ بس اوپر ہی اوپر اٹھتا ہے، پتہ نہیں ان کی کتابوں میں روح کے ایسے ہموار درد کو اچھا سمجھا جاتا ہے یا برا۔۔۔فی الحال تو یہ میرے اس گراف کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہی ہیں۔۔"

جب وہ دونوں کھلکھلاتے چہروں والی جونیئر ڈاکٹرز چلی گئیں اور اس کے درد میں بھی اب قدرتی بریک تھا تو اس نے دھیان ہٹانے کو اپنی خالہ کو پچھلے سال کا ہسپتال کا قصہ سنایا جو اس کی یادداشت پر نقش تھا اور اسے ڈراتا بھی تھا اور ہنساتا بھی تھا۔

"خالہ پچھلے سال میں، اپنے بیٹے کی پیدائش کے وقت سرکاری ہسپتال کے پرائیویٹ وارڈ کی بجائے زچہ بچہ وارڈ میں غلطی سے پہنچ گئی تھی، توبہ وہاں ایک کہرام برپا تھا"۔

اسے درد میں کبھی روتے کبھی ہنستے دیکھ کر اس کی خالہ کو اسکی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا۔۔"تم ہنس کیوں رہی ہو۔۔؟

"ہاں خالہ میں تب بھی ہنس رہی تھی۔۔ پتہ ہے وہاں ایک عورت زور زور سے چیخ رہی تھی اور "اوئے اوئے" کے ردھم میں اپنے شوہر کو گالیاں نکالتی جاتی تھی اور بار بار ایک ہی بات کہے جارہی تھی کہ اب میں تمھیں لاگے نہیں لگنے دوں گی"۔۔۔ہاہاہا حلیمہ کے ہنستے ہنستے آنکھوں سے پانی نکل آیا۔۔۔

ہمسائی خالہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے ہلکے سے مسکرادیں۔۔

اسی اثنا میں حلیمہ کا درد پھر لوٹ آیا اور وہ ہنسنا بھول کر ہونٹ بھینچے خالہ کا ہاتھ دبانے لگ گئی۔۔اور بے اختیار منہ سے "اماں" نکل گیا۔۔۔

درد کے دوران ہی خالہ بولی۔" ہائے اسی وقت مائیں سب سے زیادہ یاد آتی ہیں۔۔۔"

اس نے خالہ کے اس جملے کو ایک دفعہ پھر سے نظرانداز کر دیا۔۔۔

"خالہ پتہ ہے اس پٹھانی کو ایک پروفیسر ڈاکٹر نے ڈانٹ دیا۔۔ کہنے لگی۔۔بس کرو شور مچانا، ہر سال یہی کہہ کے جاتی ہو۔۔"ہاہاہا.... حلیمہ پھر ہنسنے لگی۔۔کیونکہ ہنستے ہوئے آنکھوں میں پانی آجائے تو انہیں چھپانا نہیں پڑتا۔۔۔

" کیا کہہ کے جاتی تھی ۔۔ خالہ بات کے تسلسل سے نکل چکی تھی اسلئے سمجھ نہ سکی۔۔۔

"یہی کہ اب کی بار شوہر کو پاس نہیں آنے دے گی۔۔۔ ہاہاہا۔۔حلیمہ کی ہنسی درد شروع ہونے پر ہی رکتی تھی۔۔۔

اب وہ پھر خالہ کا ہاتھ پکڑے دبا رہی تھی۔۔۔

"اب دردیں جلدی جلدی آرہی ہیں۔۔لگتا ہے کام قریب ہے۔۔" خالہ نے اس کے ہاتھ میں بھنچا ہوا اپنا سرخ ہوتا ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔

"ہاں خالہ اب تو سانس بھی نہیں لینے دے رہیں۔۔لو پھر شروع۔۔۔۔" آواز اس کے حلق میں ہی دب گئی اور وہ آنکھیں بھینچے چیخ کو روکنے کی کوششوں میں لگ گئی۔۔ پچھلے سال چیخیں روکنا اتنا مشکل نہیں لگا تھا، اس سال اس کا جسم اور روح دونوں کمزور ہو گئے تھے۔

"خالہ آپ کو دیر تو نہیں ہو رہی۔۔۔" وہ حسبِ معمول انتہائی مشکل وقت میں بھی دوسروں کی تکلیف کا سوچ رہی تھی۔۔۔

" دیر تو ہو رہی ہے بیٹا، بچوں نے سکول سے گھر آنا تھا، چابی ساتھ والوں کو دے تو آئی تھی مگر پتہ ہے نا بچے گھر آئیں تو انہیں ماں چاہیے ہوتی ہے۔مگر کوئی بات نہیں تمھارا

وقت کٹا کے ہی جاؤں گی۔۔۔ویسے اب تو درد ہوتی ہے تو میرا ہاتھ دبا لیتی ہو، پچھلے سال کیا کیا ہوگا تم نے۔۔۔۔"

محلے کی یہ خالہ آ تو گئی تھی مگر شائد اسے رہ رہ کے اس کی مرحومہ ماں کی یاد آ رہی تھی یا اس کے مرنے پر غصہ آ رہا تھا، ماں زندہ ہوتی اور اس وقت ساتھ ہوتی تو اس خالہ کو یہ زحمت نہ کرنی پڑتی۔

"خالہ ایک نرس اپنا ہاتھ مجھے پکڑا دیتی تھی۔۔۔۔خالہ آپ چلی جائیں، کوئی نرس آ جائے گی جب آخری دردیں شروع ہوں گی۔۔خالہ آپ کو دیر ہو رہی ہوگی۔۔۔۔۔"

"نہیں نہیں جب تک تمھیں ڈلیوری روم میں نہیں لے جاتے، تب تک میں تمھارے ساتھ ہوں بیٹا۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اور اسے اپنا آپ گاڑی کے پیچھے بھاگتے بچے جیسا لگا۔۔بے بس اور دوسروں کے رحم و کرم پر۔۔توجہ کی بھیک مانگتا ہوا ایک بوجھ۔

اب دردوں میں وقفہ ختم ہو چکا تھا، اور حلیمہ نے چیخوں کو اس دفعہ حلق میں دبایا نہیں۔۔اسے اس بات کی پرواہ بھی نہیں تھی کہ لوگ اسے چیختے دیکھ کر کیا کہیں گے۔ وہ اپنے آپ کو اس ان پڑھ عورت سے زیادہ بے وقوف سمجھ رہی تھی، جو ہر سال آ جاتی تھی۔ اس لئے جب حرکتیں وہی ہیں تو چیخنے میں کیسا مضائقہ؟۔۔اس عورت کے ساتھ اس کا شوہر نہیں تھا، ہاں اس کی ماں تھی۔ ان پڑھ لوگوں میں بچوں کے ساتھ انصاف رکھنے کی ایک قدرتی صلاحیت ہوتی ہے کیونکہ فطرت انصاف ہے لیکن پڑھ لکھ کر لوگوں کی تقدیم بدل جاتی ہے۔ وہ کئی فیصلے اپنی ذاتی پسند ناپسند پر کرتے ہیں اور اس لئے فطری توازن کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے جو جانے انجانے ناانصافی کو جنم دیتا ہے۔ انصاف کے لئے فطرت کے نزدیک رہنا ضروری ہوتا ہے۔۔شائد اسی لئے ان پڑھ لوگوں کے بارہ بچے بھی ہوں تو وہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔"

وہ نرس جس نے پچھلے سال اس کا ہاتھ پکڑے رکھا تھا، نہ جانے اس وقت کسی اور درد کی ماری، تنہا عورت کا ہاتھ اسی خندہ پیشانی سے تھامے بیٹھی ہوگی۔ اور جب اس عورت کا بچہ دنیا میں آ جائے گا تو بڑی شفقت سے اپنا زخمی ہاتھ دکھا کے کہے گی "دیکھو تم نے میرے بچارے ہاتھ کا کیا حال کر دیا" اُس نرس جیسے لوگ تکلیف میں مبتلا لوگوں کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑاتے نہ اس وقت آواز پیدا کرتے ہیں کہ کہیں ان مصیبت کے ماروں کا آخری سہارا ابھی نہ چھوٹ جائے اور چیخ دبانے والوں کو ان کا ہاتھ بغیر کسی رکاوٹ کے میسر رہے۔ کتنا پیارا چہرہ تھا اس نرس کا۔ روشن چمکتا ہوا۔ اس کے برعکس ڈاکٹر جس کی تعلیمی ڈگریاں اس نرس کی انسانی ہمدردی کے آگے ہیچ تھیں۔۔اس پر چلائی تھی۔۔

"جلدی کرو، ایک گھنٹہ ہو گیا ہے تمھیں۔۔کوئی اور ڈاکٹر ہوتی تو اب تک تمھارا آپریشن ہو گیا ہوتا۔ اتنا انتظار کوئی نہیں کرتا۔۔۔"

ڈاکٹر کی اس جاہلانہ انداز میں تنبیہ نے اسے لرزا دیا تھا اور اس نے جی جان سے زور لگا کے بچے کو دنیا میں دھکیل دیا تھا۔ اسے اس جاہل ڈاکٹر کا چہرہ بھی بھول گیا تھا مگر اس مہربان نرس کے چہرے کی روشنی آج بھی اس دل کو گرماتی تھی۔ اسی لئے آج مشکل کی اس گھڑی میں برسوں پہلے بچھڑی اپنی ماں نہیں، اُسے وہ نرس یاد آ رہی تھی۔

اور جب اسکا بیٹا دنیا میں آ گیا تھا اور ڈاکٹر نیچے ادھڑی جلد کو ٹانکوں سے جوڑ رہی تھی اور حسبِ عادت بڑبڑا رہی تھی "توبہ پہلا بچہ اتنا موٹا کر لیتی ہیں کہ نکالنا ہی عذاب ہو جائے اور دیکھو کتنے نخروں سے نکالا اسے"۔ نرس جو اس کے بیٹے کے جسم سے اسی کے گندے مادے صاف کر لائی تھی, ڈاکٹر کے جاتے ہی بچہ اسے دکھاتے ہوئے بولی تھی۔ "بڑا جوان بیٹا پیدا کیا ہے ماشاء اللہ۔۔" ڈاکٹر اس کی جلد کو ٹانکے لگا کر اس کی روح کو زخمی کر گئی تھی، نرس کے الفاظ مرہم ثابت ہوئے تھے اور وہ اپنے بیٹے کا سورج جیسا چہرہ دیکھ کہ سب درد بھول گئی تھی۔

"شائد نرسنگ میں انسانی ہمدردی پڑھائی جاتی ہے ڈاکٹری میں نہیں۔۔" اس نے باہر آ کر اپنے شوہر کو کہا تھا۔۔

"یہ تو انسان پر منحصر ہے ورنہ کتابیں کسی کا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔" اس کے شوہر کے چہرے سے بیٹے کا باپ بننے کا فخر جھلک رہا تھا۔۔

ایک جونیئر ڈاکٹر، جس کا چہرہ بہت نرم تھا اور ابھی اس میں سینئیر ڈاکٹرز والی سختی اور روکھا پن نہیں آیا تھا، بڑے پیار سے اسے بتا رہی تھی کہ کتنے سینٹی میٹر dilute ہو گیا ہے۔۔اور آج بھی اسے ہسپتال کی فضا درد کی جیل لگتی تھی، جو اپنے قیدیوں کو آزاد نہیں کرتی۔ ڈاکٹرز اور بھاگتی دوڑتی نرسیں اسے زہر لگ رہی تھیں۔ اسے لگتا تھا جیسے عمر بھر کے لئے یہ دردیں یونہی چلتی رہیں گی اور وہ سٹاف کے لئے ایک "بہترین تعلیمی سبجیکٹ" رہے گی۔

درد کی شدت جب ہولناک حد تک بڑھ گئی تو اسے ڈیلیوری روم میں لایا گیا اور اب اس کا دل کر رہا تھا excellent pains کہنے والی کسی سٹاف کے منہ پر رکھ کر مکہ مار دے۔ شائد پچھلے سال کی نقاہت ابھی مکمل طور پر گئی نہیں تھی، اسلئے اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور وہ لمحہ بہ لمحہ دردوں کے کنویں میں گرتی جا رہی تھی۔ اس کمرے میں حسبِ رواج شوہر ساتھ اندر نہیں جا سکتا تھا۔ وہ باہر ٹہل رہا ہوگا۔ پچھلے سال بھی یہی منظر تھا اور جب اس کے پاس آیا تھا تو اس کی گود میں بیٹا دیکھ کر اس نے سر فخر سے اٹھا کر کہا تھا۔۔

"دیکھو میں نے چھوٹی سی بچی کو ماں بنا دیا"۔۔ وہ چھوٹی ہی سی تو تھی، ہنستی کھیلتی، شرارتیں کرتی جس کے چہرے پر وقت ٹھہر گیا تھا تئیس کی تھی تب بھی سترہ کی لگتی تھی۔ اور جب وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کمرے میں اکیلی تھی اور بچہ اسکی چھاتی منہ میں ڈالے پچا کے مار رہا تھا تو نجانے کیسے یکا یک یہ ایک عجیب سا خیال اس کے دل و دماغ پر چھانے لگا تھا: کہ وہ جب مرے گی، تو اس کا بیٹا اسے آوازیں دے گا، مگر وہ جو اس سے اتنا پیار کرتی ہے آنکھ نہیں کھول سکے گی۔ میرے بیٹے کو میری ضرورت ہوگی اور میں بے بس ہونگی۔۔ ماؤں

کو ضرورت کے وقت بچوں سے صرف موت ہی دور کر سکتی ہے جیسے اسکی ماں زندہ ہوتی تو کیا اس کی اتنی بڑی تکلیف میں اس سے دور رہ سکتی تھی؟

خیالوں کی آندھی اسے اڑائے جا رہی تھی۔ شائد اسی لئے بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں کہ پیدائش کے بعد ماں اور بچے کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ انہیں پوسٹ پارٹم ڈپریشن کا نام نہیں آتا مگر ان کے نزدیک ایک جن ہے جو پیدائش کے بعد عورتوں کو چمٹنے کے لئے تیار بیٹھا ہوتا ہے۔۔ حلیمہ کا جن اسے موت سے ڈرا رہا تھا اور اسے اس چارپائی تک لے گیا تھا، جہاں وہ بے بس مردہ حالت میں پڑی تھی۔ اور اس کا جوان بیٹا، (نرس نے بھی تو کہا تھا کیسا جوان بیٹا پیدا کیا ہے)، اسکی چارپائی کو کندھا دے رہا تھا۔ اس نے اپنی گود میں ہمکتے بے بس بچے کو دیکھا جو اس کی مدد کے بغیر ابھی ہل بھی نہیں سکتا تھا، جو اپنا ننھا سا معدہ بھرنے کے لئے اس کے دودھ کا محتاج تھا، کل کو میں اس کے بازوؤں کی محتاج ہونگی جب وہ مجھے، اپنی بے بس ماں کو، اسکی آخری منزل تک چھوڑ کر آئے گا، اور وہ تب اس کی مدد کے بغیر قبر میں نہیں اتر پائے گی۔ دنیا کا نظام یہی ہے میں اسے دنیا کی پہلی منزل میں لائی ہوں یہ مجھے آخری منزل تک چھوڑ کر آئے گا کیسا ظالم ہوتا ہے یہ وقت کا پہیہ۔۔

اس کی آنکھیں اس منظر کے تصور میں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔۔

"بیٹی تم پر ماں بن کر بہت روپ آیا ہے۔ رو کیوں رہی ہو؟ ماں بن کر عورت مکمل اور حسین ہو جاتی ہے، تمھارا ہر طرف سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ دیکھنا اپنے شوہر کی نظر میں تم کتنی معتبر ہو جاؤ گی۔۔"

نرس جب اس کا ٹمپریچر دیکھنے آئی تو اسے روتا دیکھ کر اپنی طرف سے خوش کرنے لگ گئی تھی۔

اب کے برس درد نا معلوم نہیں تھا، اجنبی نہیں تھا، جانا پہچانا تھا۔ جاننے کا بڑا نقصان ہوتا ہے کیونکہ اسے سب پیچ و خم سے آشنائی تھی۔۔ اس کی چیخیں کمرے کی چھت پھاڑ رہی

تھیں ۔۔اسے نہیں پتہ کب وہ آخری چیخ اس کے منہ سے برآمد ہوئی جس کے ساتھ بچہ دنیا میں آتا ہے۔۔وہ تو نرس کی آواز سے ہوش میں آئی۔۔

"بیٹی ہوئی ہے"۔۔۔

پھر اس کے ساتھ ایک نازک سا پھول سٹریچر پر لٹا دیا گیا تھا اور جو آیا اسے گھسیٹ رہی تھی بولی:

"پیسے دے دیں، میں نے آپ کی غلاظت صاف کی ہے۔۔بچی کے ساتھ ہی آپ نے۔۔۔۔"

وہ جو مارے کمزوری کے آنکھیں بھی کھولنے سے قاصر تھی اور ابھی تک اپنی نوازائیدہ بچی کو بھی نہیں دیکھ پائی تھی ایکدم سے غصے میں بھر گئی۔۔

"تمھارا خیال ہے کہ میں اندر ڈیلوری روم میں اپنا بٹوہ سینے سے لگائے بیٹھی ہوں۔۔۔"

صفائی والی مائی کھسیانی ہوگئی۔۔"نہیں میرا مطلب کمرے میں جا کر اپنے خوند کو بتا دینا، کہ میں نے آ پکی۔۔۔۔۔"

"اچھا چپ کرو۔۔۔۔۔۔شرم اور نخوت سے اس کا برا حال ہو گیا تھا۔

" کسی اور کو نہ پیسے دے دیں۔۔۔" مائی اپنے مدعے پر قائم رہی۔۔۔

"توبہ یہ پرائیویٹ ہسپتالوں کا یہ حال ہے جہاں فیسوں کے نام پر مریضوں کے بنک بیلنس نچوڑ لئے جاتے ہیں۔وہاں کے تنخواہ دار عملے کا یہ حال کہ بھکاریوں کی طرح پیسے مانگتے ہیں"۔اس کے شوہر نے غصے میں کہا، جب حلیمہ نے کمرے میں آتے ہی بیٹی دکھانے سے بھی پہلے اسے اس مائی کے دعوے کے متعلق آگاہ کیا تھا۔

"اچھا نا! پیسے دے دیں اسے۔۔۔"

مائی نے پیسے پکڑتے ہی خریدی ہوئی دعائیں انہیں دیں اور بھاگ کر کمرے سے

نکل گئی، کیونکہ اس کے بعد ڈیلوری روم میں ایک اور عورت کو لے جایا جا رہا تھا، وہ کوئی بھی چانس یا عورت مس نہیں کر سکتی تھی۔

"میری بیٹی کتنی پیاری ہے، دیکھنا اس کی پیدائش کی خبر سنتے ہی "میرے ناراض گھر والے مان جائیں گے اور بھاگے بھاگے اسے دیکھنے آجائیں گے۔۔ہمارے خاندان میں سارے ہی لڑکے ہیں۔یہ پہلی بیٹی پیدا ہوئی ہے۔۔"

اس نے فاروق کے تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور سوچا "اب تو وقت گذر گیا کوئی آئے یا نہ آئے اب کیا فرق پڑتا ہے۔۔"

اس نے دردوں کا وقت کبھی کسی نرس اور کبھی کسی ہمسائی کا ہاتھ پکڑ کر اکیلے ہی گذار لیا تھا۔۔اس کے شوہر نے پہلے بیٹے کی پیدائش پر بھی یہی کہا تھا کہ برف پگھل جائے گی، میرے ابو بچے کا سنتے ہی بھاگے آئیں گے اور تمھیں اپنی بہو تسلیم کرلیں گے۔مگر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔برف پگھلنے کی بجائے مزید جم گئی تھی۔

فاروق، مرتضی کیسا ہے اسے دیکھ آئے؟ بھائی کو تنگ تو نہیں کر رہا تھا؟ حلیمہ کو فرصت ملتے ہی بیٹے کی فکر کھانے لگی۔

وہ بدمعاش بالکل ٹھیک ہے، خالہ فریدہ تمھیں چھوڑ کر چلی گئیں تھیں؟

"ہاں انہیں جانا تھا، انہوں نے پہلے ہی کہا تھا جب مجھے ڈیلیوری روم میں لے جائیں گے تو وہ چلی جائیں گی۔"

"ہوں۔۔۔چلو بڑا احسان ہے ان کا، تمھیں بھوک لگی ہوگی کیا لاؤں۔۔۔؟"

" کوئی گھر کی پکی چیز لا سکتے ہو؟ کوئی دال، کوئی سبزی۔۔۔اس نے بڑی حسرت سے فرمائش کی۔۔ابھی ساتھ والے کمرے سے بہت مزے کی خوشبو آ رہی تھی۔۔"

" پھر ایسا کرتا ہوں ساتھ والے کمرے سے ہی مانگ لاتا ہوں۔۔گھر کا کھانا کہاں سے لاؤں؟"

"میرا بھوک سے برا حال ہے اور ابھی کوئی باہر کی چیز نہیں کھا سکتی اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔۔" اس کی آنکھوں میں بار بار نمکین پانی اتر رہا تھا۔۔

"اچھا ایسا کرتا ہوں ابھی سوپ لے آتا ہوں۔۔" اس کے شوہر کی خوبی تھی یا خامی اس کا مشاہدہ بہت کمزور تھا اس لئے وہ حلیمہ کے آنسو نہیں دیکھ پایا تھا۔۔۔

"اچھا!! کمزور سی آواز حلق سے ابھری۔۔۔

اب وہ کمرے میں پھر تنہا رہ گئی تھی۔۔ بیٹی کا چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔کتنی خوبصورت تھی اسکی بیٹی، بالکل چاند جیسا چہرہ۔۔

بیٹے کا نام انہوں نے اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی سوچ رکھا تھا، بیٹی کا ابھی سوچا جا رہا تھا۔۔ہسپتال میں نام کے اندارج کے لئے بھی ابھی وقت مانگا تھا۔۔ ماہ رخ۔۔ ایسی چاند چہرہ کا نام ماہ رخ کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوسکتا۔۔

سال پہلے والا تنہائی کا جن ایک دفعہ پھر سے ذہن میں پسر کر آ بیٹھا تھا۔۔اب منظر میں جنازے کی چار پائی نہیں تھی بلکہ ایک ڈولی تھی، چار کندھوں پر سوار ایک ڈولی۔۔کہار ڈولی کو حلیمہ سے دور لئے جا رہے تھے۔۔اس کی ناڑو سے کاٹ کے اس کی ماہ رخ کو ڈولی میں بٹھا دیا گیا تھا۔۔ وہ ہمکتے ہمکتے چہکنے لگ گئی تھی۔۔ یہ تو بڑی ہوگئی۔۔ میری طرح بڑی ہوگئی؟

اپنی ماں سے دور ہوگئی؟

میرے ناڑو سے خود کو دور لے جائے گی اور پھر اس کے ناڑو کے ساتھ ایک بچہ آ کر چپک جائے گا۔۔؟

اس بچے کو دنیا میں لانے کے لئے یہ یہی دردیں سہے گی کبھی چیخے گی کبھی برداشت کرے گی اور کیا ڈاکٹر اسے بھی چیخ کر کہے گی؟ جلدی کرو، کوئی بچہ پیدا کرنے میں اتنا بھی نخرہ کرتا ہے، کیا یہ بھی دردوں کی تکلیف سے گھبرا کر سوچے گی مرنا آسان ہے یا اس درد کا

سہنا؟

اف یہ دردیں۔۔ یہ ماہ رخ کو آنے والی دردیں۔۔۔۔کیا صفائی والی آیا اس کے فارغ ہوتے ہی اسے بھی یاد دلائے گی کہ بی بی مجھے پہلے خوش کر دیں۔۔۔ یہ جو، اب میری گود میں اپنی سب تکلیفیں، سب پریشانیاں ڈال کر معصومیت سے بے خبر سوئی ہوئی ہے، ایک وقت آئے گا میں اس کی تکلیف بٹا نہیں پاؤں گی اور بے بسی سے اسے دردوں سے تڑپتے دیکھوں گی۔؟"

اس سوچ نے حلیمہ کو اتنا رلایا کہ اسکی ہچکی بندھ گئی۔۔ بیٹے کے کندھوں پر سوار خود کو جنازے کی چار پائی پر بے بس لیٹے تصور نے اسے اتنی اذیت میں مبتلا نہیں کیا تھا جتنی بیٹی کی ممکنہ دردوں نے اسے نڈھال کر دیا۔۔، میں کیا کروں گی۔ہائے میرے اللہ میں کیا کروں گی۔۔۔؟

اس نے سوئی ہوئی بچی کا ننھا سا ہاتھ گھبرا کر تھام لیا اور عہد کرنے والے انداز میں بولی:

"میری ماہ رخ، میری پری میں تجھے تیرے ایسے نازک وقت میں کبھی اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی، تیرے ہاتھ کو کسی نرس یا کسی ہمسائی کے سہارے اکیلا نہیں چھوڑوں گی، تیرے لئے میرا ہاتھ ہوگا، ایک ماں کا ہاتھ جسے تھام کر تو درد کے اس سمندر کو آسانی سے پار کر جائے گی۔ مجھے اس درد میں ماں کا ہاتھ تھام کر گذرنے کا تجربہ نہیں۔۔مگر تو مجھے بتانا کہ کیا ماں کا ہاتھ ہاتھ میں ہو تو درد کی شدت کم ہو جاتی ہے؟

کم ہوتی ہے یا نہیں مگر مجھے پتہ ہے اس وقت آنکھوں میں ماں کی تصویر ہی ہوتی ہے اور میں تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اگر مرتضیٰ میرے جنازے کی چار پائی کو کندھا دے کر بھی لے جا رہا ہوگا، تو تیری درد کی چیخ سنتے ہی موت کو دھوکہ دے کے وہاں سے بھی تیرے پاس بھاگ کر آ جاؤں گی۔مرتضیٰ کی پکار پر نہیں تیری چیخ پر ضرور لوٹ آؤں گی، یہ

میرا تجھ سے وعدہ ہے میری ننھی پری، تجھے یہ درد کبھی اکیلے نہیں سہنے دوں گی۔۔۔اب اداسی کا جن اس کے پورے وجود کو لپیٹے ہوئے تھا۔ فاروق سوپ پکڑے لوٹا تو کمرے میں سسکیوں کی گونج سن کر ٹھٹک گیا۔۔

اسے یوں پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر کچھ اور ہی سمجھا اور چڑ کر بولا۔۔۔

"بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں تم کیا جاہل عورتوں کی طرح بیٹی کا سوگ منا رہی ہو، دیکھو میری بچی کو دہلا دیا ہے تم نے۔۔۔" آج فاروق کے چہرے پر بیٹی کے باپ ہونے کی رحمت جھلک رہی تھی۔

اور وہ فاروق کے ڈر سے اپنے آنسو چھپانے کے لئے رضائی کے سینے میں گھستی چلی گئی، اسے لگا جیسے رضائی اس کی ماں ہے اور فاروق کو ڈانٹ رہی ہے کہ:

"چپ کرو تم نے تو میری بچی کو دہلا دیا ہے۔۔۔۔"

کہانیوں کی کتاب!!

وہ بہت پیارا بچہ تھا جیسے بچے ہوتے ہیں، مگر وہ عام بچوں سے کہیں زیادہ ذہین تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی، جاننے کی خواہش رکھنے والی چمک تھی۔ وہ ماں باپ کے درمیان میں چل رہا تھا اور کبھی ایک کا چہرہ اور کبھی دوسرے کا دیکھ کر کوئی نہ کوئی سوال پوچھتا جاتا تھا۔

بچے کا باپ گھبرا کر اس کی ماں سے پوچھتا قاسم کے ان مشکل سوالوں پر خوش ہونا چاہیے یا خوفزدہ؟

ماں فخر سے اپنے بیٹے کو دیکھتی، بولتی کچھ نہ بس رعونت سے مسکرا کے رہ جاتی مگر دل میں سوچتی یہ میرے وہ ادھورے خواب پورے کرے گا جو میں کبھی اپنے لئے دیکھتی تھی اور جو میرے خاندان کی میراث ہیں، جو مجھ تک میرے باپ کے ذریعے پہنچے تھے۔

مگر آج اس کے چہرے کی طرح اس کا دل بھی سپاٹ تھا، وہ اپنے شوہر کے سوالوں کا جواب دینا تو دور کی بات ہے اسے دیکھنا بھی پسند نہیں کر رہی تھی۔

سڑک کنارے ایک پتھر پڑا ہے، اس کی ماں کے چہرے پر صاف پڑھی جانے والی تھکاوٹ ہے اور وہ وہیں اُسی پتھر پر بیٹھ گئی ہے جو نجانے کب سے اُدھر ہی دھرا ہے اور کتنے لوگ اس پر کبھی اپنی تھکاوٹ مٹانے اور کبھی بکھرے خوابوں کو سمیٹنے بیٹھ جاتے ہیں۔ باپ کو اپنی ہمسفر کے پیچھے رہ جانے کا احساس تک نہیں ہوا اور وہ بچے کی انگلی تھامے آگے

ہی آگے چلتا جا رہا ہے مگر بچہ مڑ مڑ کے ماں کو دیکھ رہا ہے، اس چھوٹی سی عمر میں اسے سمجھ آ گئی ہے کہ اسکی ماں ساتھ نہیں ہے، وہ چاہتا ہے کہ باپ کو بھی پتہ چل جائے کہ "ماں ساتھ نہیں ہے"۔ وہ ماں کے رکنے سے خوفزدہ ہو گیا ہے، اس سے اب بولا بھی نہیں جا رہا ہے، سارے سوال حلق میں پھنس گئے ہیں اور وہ ایسی جگہ ماں کو رکتا نہیں دیکھنا چاہتا جہاں باپ اس کے ساتھ نہیں رک رہا، اور باپ کو ایسے چلتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا جہاں ماں کے رکنے کا اسے احساس نہ ہو۔

باپ کے تیز تیز قدموں کا ساتھ دیتے دیتے وہ ہانپ گیا ہے، ماں کو اس پتھر پر پتھر کی طرح بیٹھے دیکھ کر وہ سہم گیا ہے۔ باپ بچے کی ذہانت سے بہت مطمئن ہے، اس لئے وہ اپنے قدم آہستہ نہیں کر رہا۔ وہ سوچ رہا ہے یہ فطین بچہ دنیا کی تیز رفتاری میں اس کا نام روشن کرنے کی بھرپور اہلیت رکھتا ہے اور یہ بچہ دنیا کو اپنے آگے جھکا دے گا۔ اسے اپنا بچپن یاد آتا ہے، جہاں اس کا باپ پاکستان کے چھوٹے سے گاؤں میں پیری فقیری کی گدی پر بیٹھا ہے، لوگ اس کے آگے جھک تو رہے ہیں مگر وہ دنیا کو جھکانے میں ناکام ہے۔ لوگ آپ کے آگے سر جھکائیں مگر آپ دنیا کو نہ جھکا سکیں تو غربت جنم لیتی ہے۔ وہ آٹھ بہن بھائی تھے جو لوگوں کے گھروں سے آیا ہوا کھانا کھاتے تھے۔ جہاں کھانا کھانے کی خود مختاری نہیں تھی تو وہاں خوابوں کو دیکھنے اور پالنے کی عیاشی کہاں سے آتی؟ باپ نے پیری تو خوب کی مگر غربت کو مات نہ دے سکا اور بچے کھاتے پیتے رشتہ داروں میں تاش کے پتوں کی طرح بانٹ دئے۔ وہ آج تک اپنے گھر کی چھت سے نکل کر رشتے داروں میں بانٹے جانیکی اذیت سے نہیں نکل سکا، یہاں تک کہ کینیڈا جیسے بڑے ملک میں بیٹھ کر بھی، وہ زیادہ بچوں کے پیٹ بھرنے کے خوف اور نہ بھرنے کی صورت میں بچوں سے بے وفائی کے خوف کو دل سے نہیں نکال سکا۔ اسی لئے اس نے پہلی رات ہی اپنی بیوی کو بتا دیا تھا کہ میں

صرف ایک بچہ پیدا کروں گا اور اس کا اپنے جیسا نام تو نہیں رکھ سکتا مگر اسے اپنی نامکمل خواہشوں کو پورا کرنے کا کام ضرور دے سکتا ہوں۔

اسے یاد آ رہا تھا جب باپ نے اچھے مستقبل کا ایک لاجواب بہانہ تراش کے اسے ایک امیر رشتے دار کے حوالے کر دیا تھا تو ماں بھی اس سازش نما قربانی میں چُپ کر کے ساتھ ہی مِل گئی تھی۔ دونوں کی سازش سے اسے اچھا مستقبل تو مل گیا مگر ماں باپ کی توجہ اور پیار سب اس آٹے میں گندھ گیا۔ اسی لئے وہ ہر وقت اپنے آپ سے یہ عہد دہراتا رہتا "میں اپنے بیٹے کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہونے دوں گا"۔

محبتوں کا مارا ہوا، نہ بچے کے اکھڑتے قدم دیکھ رہا ہے اور نہ ماں کو اپنے خوابوں کے ساتھ پیچھے پتھر ہوتے دیکھ رہا ہے، اس کے قدم اور تیز تیز اٹھ رہے ہیں اور بچہ اب باقاعدہ ساتھ گھسٹ رہا ہے

باپ کے بالکل برعکس اس کی ماں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی ماں کے باپ نے اس کی آنکھوں میں رنگا رنگ خواب سجائے تھے۔ ماں کی زندگی کی کتاب خوابوں سے بھری پڑی تھی۔ نانا، ماں کو فیری لینڈ میں رکھتے تھے، عام لوگوں کی پہنچ سے دور۔ ماں نے شادی کے بعد اپنے گھر کو بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایک طلسماتی محل میں بدل رکھا تھا، عام لوگوں کی دسترس سے دور، گھر کے کونے کونے میں خوابوں کی کیاریوں کی کیاریاں بھری پڑی تھیں جن سب کو پانی دینے کا کام وہ قاسم کو سمجھاتی رہتی تھی اور وہ اکتا کر ماں سے کہتا بس کرو ماں مجھے ان خوابوں سے ڈر لگتا ہے۔

"رنگین خوابوں سے ڈر؟ ماں اسے پیار سے ڈانٹ کے پوچھتی تھی

"ہاں ماں پتہ نہیں کیوں، مجھے لگتا ہے یہ رنگ میری آنکھوں کو اندھا کر دیں گے" وہ ماں کو بہلاتا ہے، چھ سال کی عمر میں تیس سال کی ماں کو جان لینا کتنا کرب ناک ہوتا۔ ماں

نے اپنے سارے خواب سیسے کی طرح اس کے کانوں میں انڈیل رکھے ہیں اور اس کی آنکھوں کو ان خوابوں سے اتنا بھر دیا ہے کہ بچے کے پاس اپنے خوابوں کے لئے اپنی آنکھیں ہی نہیں باقی بچیں اور اسے اپنے اندھے پن کا احساس ستانے لگا ہے۔

"اندھے ہوں تیرے دشمن اور ماں گھبرا کر اسے سینے سے لگا لیتی تھی۔

دوسری طرف باپ، بہت سے بچوں میں پیدا ہو جانے والا ایک اور بچہ، اپنی محرومی کی ماری کہانیاں سناتا رہتا تھا، وہ اس سے بھی اکتا کر پوچھتا تھا" ابا آپ کی کہانیوں میں کیا کوئی ایسی کہانی نہیں ہے جسے سن کر میں ہنس سکوں؟"

باپ رو دینے والا ہو جاتا اور کہتا میری زندگی میں بس یہی رلا دینے والی کہانیاں ہیں۔ ہنسنے والی کہانیاں کہاں سے لاؤں؟ لیکن جب تمھاری زندگی کی کتاب تیار ہوگی تو اس میں بہت ہنسنے ہنسانے والی، دل کو لبھانے والی رنگا رنگ کہانیاں ہونگی۔

خوابوں میں قید ماں اور محبتوں کا مارا باپ وہ دونوں اس میں اپنی اپنی روح تحلیل کرنے میں لگے رہتے تھے اور کہتے قاسم تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمھیں اتنا پیار اتنی توجہ اور اتنے سارے خواب مل رہے ہیں۔ مگر وہ سوچتا اگر وہ اتنا ہی خوش قسمت ہے تو اس کے کمزور کندھے ابھی سے خوابوں اور عذابوں کے بوجھ سے جھک کیوں رہے ہیں؟ اور اندھا ہونے کا خوف اسے دن بدن کیوں کھائے جا رہا ہے؟

نسیمہ اور ابصار کے گھر میں قاسم کو ایک بچے کی طرح نہیں بلکہ ایک تیسرے بڑے فرد کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ اس سے کبھی کسی نے بے بی ٹاک نہیں کی تھی۔ اس نے خود بھی کبھی تھتھلا کر بات نہیں کی تھی، اس کی زبان اور سوچ دونوں میں ہی روانی اور پختگی تھی۔ وہ ماں باپ کے خوابوں اور کہانیوں سے اکتا تو جاتا تھا مگر بڑی ذمہ داری سے سوچتا تھا کہ خدا نے اسے ان کے پاس شائد بھیجا ہی اسلئے تھا کہ وہ سب انہیں دلا دے جو آج تک انہیں زندگی

نے نہیں دیا۔

باپ کے ساتھ چلتے چلتے اس نے مڑ کر پھر ماں کو دیکھا جو وہیں پتھر پر نڈھال بیٹھی ہے۔

آج سے پہلے وہ کبھی چلتے چلتے رکتی نہیں تھی۔ اسکی ماں ہمیشہ اس کے باپ کے ساتھ قدم ملا کے چلتی رہتی تھی یہاں تک کے ان کا "مختلف سا گھر" آ جاتا تھا، جہاں سامان کم اور خواب اور امیدیں بھری پڑی تھیں۔

اب وہ سوچ رہا تھا، کل رات جو ماں باپ کے کمرے سے ماں کی روتے ہوئے بولنے کی غیر معمولی آوازیں آ رہی تھیں، ماں کا تھک کر رک جانا اور باپ کا متوجہ نہ ہونا، کیا اس کا سلسلہ کل رات سے جڑا ہوا ہے؟ اس وقت بھی وہ خوف سے اپنے کمبل میں دبک گیا تھا اور اب بھی اس کا جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ ان دونوں نے دن کا آغاز اور اس واک کا آغاز نارمل طریقے سے شروع کرنے کے لئے جتنے بھی جتن کئے تھے، ارادے باندھے تھے، اب وہ سب پتھر پر ڈھیر ہو چکے تھے۔ دونوں ہی منافق نہیں تھے اس لئے بس اتنا ہی بھیس بدل سکے۔

گھر پہنچتے پہنچتے وہ دونوں "سب اچھا ہے" کا ماسک پہنے پہنے تھک گئے تھے اور وہ کوئی بچہ تھوڑی تھا، وہ تو اس گھر کا ایک تیسرا بالغ فرد تھا گھر کے اندر آتے ہی ماں کو نجانے کیا ہوا اس نے بچے کو کندھے سے زور سے پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا، باپ نے ہلکا سا احتجاج کیا۔۔ "بچہ ہے دور رکھو اسے"۔

"نہیں ہے بچہ، اسے بھی سب پتہ ہو۔۔۔ پتہ ہو کہ اس کی ماں کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے اور اسے پتہ ہو دھوکہ کیا ہوتا ہے۔ وہ ہسٹریائی انداز سے چیخی۔

باپ نے بے بسی سے بچے کو دیکھا "اچھا بتاؤ اسے سب بتاؤ۔۔۔"

"تمھارے باپ کا شادی سے پہلے کسی عورت سے جسمانی تعلق تھا، اس نے مجھے خود نہیں بتایا۔ کل اس کے بھائی نے فون کر کے بتایا۔ اس شخص نے ہمارے یعنی میرے اور اپنے رشتے کی بنیاد جھوٹ پر رکھی، دھوکے پر رکھی۔ اس نے میرے آئیڈلزم کے سارے بُت توڑ دیئے ہیں۔ اس گھر کو جس سچائی کے ساتھ میں نے سینچا تھا وہ برباد کر دی اس نے۔۔۔۔"

"تم شادی سے پہلے ہوئی کسی بھی غلطی کو دھوکہ کیسے کہہ سکتی ہو؟ باپ غرایا۔۔۔

غلطی؟ یہ غلطی ہوتی ہے۔۔ اور دھوکہ یہ ہے کہ تم نے مجھ سے چھپایا۔۔ ماں بھی اسی طرح غرائی

چھپانا دھوکہ نہیں تھا، مصلحت تھی اور مصلحت سے بولے گئے جھوٹ، جھوٹ نہیں ہوتے۔۔۔ باپ نے بچے کی بدلتی رنگت دیکھ کر اپنے انا کے غبارے سے ہوا تھوڑی کم کرنے کی کوشش کی۔

مگر ماں اور پھُول گئی؛ تم انصاف کی بات کرتے تھے نا کہ زندگی نے تم سے انصاف نہیں کیا۔ اب میں تمھیں بتاؤں گی انصاف کیا ہوتا ہے؟

اب وہ دونوں بچے کو بٹھا کر بھول چکے تھے اور وہ دھوکے، جسمانی تعلق، مصلحت، آئیڈلزم، انصاف، ان کے معنی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر ماں باپ کی زوردار آوازوں سے اس کا دماغ کام کرنا بند کر چکا تھا اور وہ صرف سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ یہ اس گھر کے لئے اور اس بچے کے لئے ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ وہ بچہ نہ نظر آنے کے لئے، اپنے کانپتے ہاتھ، دھڑکتا دل، ماتھے پر آیا پسینہ چھپانے کے لئے جتن کر رہا تھا۔ بڑا نظر

آنے کی کوشش میں اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ پھیل گئی تھیں اور سر نارمل سے زیادہ اٹھ گیا تھا۔ مگر اس سے زمانے بھر کی محبت کرنے والے، اس کے آئیڈیل ماں باپ، اپنی اپنی اناؤں کے خول میں بند یہ فرق دیکھ ہی نہ پائے۔

اور پھر اس گھر پر ایک اعصاب شکن خاموشی چھا گئی۔ جس گھر کی دیواروں اور دروازوں پر تتلیوں، پھولوں کے رنگ اور خوابوں کی باتیں منقش تھیں وہاں اب ٹوٹے ہوئے اعتماد کی اور اناؤں کی خاموش قبریں ابھر آئیں۔ ایک ننھی سی قبر بچے کے نومولود خوابوں کی اس کے اپنے ہی اندر کھدنے لگی۔ "قبر زیرِ تعمیر" کا بورڈ پھیلی آنکھوں سے نظر آنے لگا۔

قبروں کے اس گھر میں خاموشی کے دن اور سسکیوں بھری کئی راتیں گذر گئیں۔ اور پھر ایک دن ماں نے باپ کو انصاف دینے والا وعدہ پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ باپ کا بچپن ناانصافیوں نے ڈس لیا تھا، اس نے ماں کے اس غیر فطری فیصلے کو قبول کرتے ہوئے کہا:

"ٹھیک ہے تم بھی وہی غلطی کر آؤ جو شادی سے پہلے مجھ سے سرزد ہوئی، اور جب ہم ہم پلہ ہو جائیں تو پھر سے ایک نئی زندگی شروع کر دیں گے، میں تمھاری محبت میں یہ کڑوا گھونٹ بھی بھرنے کو تیار ہوں اور، یہیں اپنے لئے اور قاسم کے لئے تمھارا انتظار کروں گا۔ مجھے تمھاری یہ ڈیل منظور ہے۔

مگر بچہ اس ڈیل کو سمجھ نہیں پایا۔ وہ اپنے آپ کو جتنا بڑا مرضی تصور کر لیتا، تھا تو "بیچارہ" بچہ ہی۔ ماں جو ہر لمحے اسے کسی بڑے فرد کی طرح پیش آتی تھی، اب اس کی انگلی کسی دو سال کے بچے کی طرح تھامے گھر کی دہلیز پار کر گئی۔ وہ گھر جو سچ کے نعروں سے گونجتا رہتا تھا، ایک اور سچ کی تلاش میں خالی ہو گیا۔ وہ گھر جہاں انصاف ہی کی دہائی تھی،

ایک اور انصاف کی کہانی لکھنے کے لئے ویران ہو گیا۔ بچے نے مڑ کر گھر پر نگاہ ڈالی۔مگر آنکھیں اتنی بھیگی ہوئی تھیں کہ اس گھر میں بسنے والی سب تتلیاں مرجھائی نظر آئیں۔اس فیصلے کے بعد آج باپ نڈھال سا بیڈ پر بیٹھا تھا، بالکل اسی طرح جیسے اس دن ماں پتھر پر تھکی ہاری بیٹھی تھی۔۔اس دن باپ اس کی انگلی تھامے اسے گھسیٹ رہا تھا۔آج ماں بغیر پیچھے مڑے اس کی انگلی تھامے تیز تیز چلتی گھر کی چار دیواری پار کر گئی۔

اب وہ اپنی ماں کے ساتھ جس انکل کے گھر آیا، وہ اس کے باپ کا قریبی دوست تھا۔ یہاں آتے ہی ماں اس کے کندھے سے لگ کر رونے لگی اور وہ انکل بڑی توجہ سے سب سنتا اور ماں کو سینے سے بھینچتا رہا۔۔پھر وہ دونوں بچے کو باہر بٹھا کر اندر کمرے میں چلے گئے۔جب وہ دونوں بہت دیر تک باہر نہ آئے تو وہ ڈر گیا۔اس پر خوف اتنا حاوی ہو گیا کہ وہ ماں کی بات بھی بھول گیا، جو اندر جانے سے پہلے اسے سختی سے وہاں سے ہلنے سے منع کر کے گئی تھی۔اور وہ ڈرا ہوا بھاگ کے دروازے کی درز سے چمٹ گیا۔وہاں سے بچے نے دیکھا کہ ماں بیڈ پر بیٹھی قمیض سیدھی کرتے ہوئے پیار سے اس کے باپ کے دوست کو دیکھ رہی تھی جو کہ اپنی شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے کھڑا تھا۔بچے نے اس کی آنکھیں پڑھنے کی کوشش کی وہاں اب ہمدردی نہیں بلکہ بیزاری تھی۔بچہ ماں کو کھڑے ہوتے دیکھ کے بھاگ کر واپس اسی جگہ بیٹھنا چاہتا تھا جہاں ماں بٹھا کر گئی تھی، مگر ایک دم سے پھر اس کی نظریں ماں کے چہرے کی طرف اٹھ گئیں اور اس کے پیر زمین نے پکڑ لئے، مڑ کر دیکھنے سے ہی انسان پتھر کے نہیں بن جاتے بس "فقط دیکھنے" سے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔۔ماں کی آنکھوں میں پیار کی جگہ ذلت اور شرمندگی نے لے لی تھی، وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔اس آدمی نے ماں کے ہاتھ پر پیسے رکھے تھے، اور ماں ہکلا رہی تھی" میں تو میں تو۔۔۔۔"

دوست سینہ تان کے بولا ،"کوئی بات نہیں یہ میرا فرض ہے، میں آپکی ضرورت کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا، آخر آپ کے شوہر کے ساتھ برسوں کی دوستی ہے "

بچہ اس کا احسان اور ماں کی شرمندگی دونوں سمجھنے سے قاصر تھا۔اس نے سوچا تو کیا یہ ڈیل تھی؟ اور پیسے تو باپ بھی ماں کو دیتا تھا، مگر ماں کا چہرہ ایسا ذلت بھرا نہیں لگتا تھا۔تو کیا یہ ڈیل کا حصہ نہیں تھا؟

"میں کچھ دن یہاں رہوں گی اور پھر چلی جاؤں گی"، ماں کی آواز جو ہمیشہ پر اعتماد ہوتی تھی اور اس بچے کو بھی اعتماد کی روشنی بخشتی تھی، آج متزلزل سی کہیں دور سے آتی سنائی دی اور بچے کے جسم میں ایک سنسناہٹ بن کر پھیل گئی۔

"بھابی، میرے بیوی بچے کل پاکستان سے واپس آ رہے ہیں اس لئے آپ اس گھر میں نہیں رہ سکتیں، اسی لئے تو آج ہی۔۔اس نے ماں کی مٹھی میں دبے پیسوں کی طرف دیکھتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور ماں پھر شرمندگی سے سفید پڑ گئی۔۔۔

ماں کے منہ سے بس "اچھا" نکلا۔

اس دروازے کے اندر ہی شائد ماں نے اپنی کمزوری، ذلت اور شکست کو چھوڑ دیا اسی لئے اپنے گھر واپس آتے ہی وہ سب بھول بھال کر پھر سے ڈکرا رہی تھی اور باپ کے کندھے جھکے ہوئے اور چہرہ کسی سو سال کے بوڑھے کی طرح جھریوں سے اٹا ہوا تھا، انکل کے گھر بچے سے ماں نہیں پہچانی جا رہی تھی، یہاں اپنے گھر واپس آ کر اس کے لئے اپنے باپ کو پہچاننا مشکل ہو گیا۔

باپ کو دھڑلے سے گناہ میں برابری کی کہانی سناتے ہوئے ماں کے سینگ اس کے پورے چہرے پر نمایاں ہو گئے اور باپ نے سنتے سنتے اپنی عزت اور عزتِ نفس

دونوں کو وہیں دفن کر دیا۔ اب اس کے چہرے پر شناسا سا ذلت کا رنگ پھیل گیا۔ بچہ اب اس رنگ کو پہچاننے لگا تھا، ماں کی اپنی عدالت کے اپنے ہی انصاف کے فیصلے نے دونوں کے چہرے پر ایک جیسا رنگ پھیر دیا تھا۔۔ ذلت کا رنگ۔۔

تو کیا انصاف مکمل ہوا؟ کیا ڈیل ڈن ہوگئی؟ بچے نے دل ہی دل میں اپنے سے سوال کیا۔ کیونکہ اب اس کے سوالوں کے جواب دینے والے اپنی تلاش میں بچے کی آواز سے بہت دور نکل گئے تھے۔

شائد انصاف تو مکمل ہوگیا مگر ساتھ رہنا مشکل ہوگیا۔ بچہ بڑا ہو رہا تھا اور دیکھ رہا تھا ماں نے گناہ میں برابری کر کے بھی دیکھ لیا، باپ کے راستے میں کانٹے چُن چُن کے بھی دیکھ لیا مگر اس کے اندر کی آگ تھی کہ بجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ پھر ایک اور انکل جن کی بیوی دماغی مریضہ تھی، اس کے ساتھ ماں کو عشق ہوگیا۔ باپ کو احساسِ جرم میں مبتلا کر کے، اس سے جان چھڑا کے، ماں، روز نت نئے عشق میں گرفتار ہونے لگی۔ لوگ باتیں بنانے لگے اور لوگ بھی ایسے ظالم جو باتیں بناتے یہ بھی نہ سوچتے کہ بچہ سن رہا ہے۔ یا شائد اسے سب بچہ سمجھتے کہ بچے کو کیا سمجھ، یہ تو صرف اس کے ماں باپ جانتے تھے کہ وہ بچہ نہیں بلکہ ایک مکمل باشعور فرد ہے۔ لیکن وہ تو اب خود دونوں بچے بنے اپنی زندگیوں سے کھیل رہے تھے۔

باپ ماں سے کہتا "اب تو میرے پاس لوٹ آؤ، اب تو سب حساب برابر ہو گئے، بس ختم کر دو اب سارے قصے کو ۔"

مگر ماں اسے کہتی مجھے تم سے شدید نفرت ہو چکی ہے۔ تم نے میرے اعتماد کو ڈسا ہے اور میں کسی سانپ کو اپنے جسم سے کھیلنے نہیں دوں گی۔

حالانکہ ماں کے نئے عشق کا انجام بھی پہلے جیسا ہی تھا کیونکہ وہ دماغی مریضہ کا شوہر بھی اپنے بچوں اور والدین کے دباؤ سے تنگ آ کر اسے استعمال کر کے چھوڑ چکا تھا، اور ماں اس کے غم میں بال بکھیرے بیٹھی تھی، اسے باپ کی التجائیں کہیں سنائی نہیں دے رہی تھیں، اور نہ اسے باپ نظر آتا تھا۔

کتنے دھوکے اور کھاؤ گی؟ کتنی بار جسم اور روح کو چھلنی کراؤ گی تو میری سزا مکمل ہوگی؟ یہ کوئی سزائے موت تھوڑی ہے جو زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوگی؟ باپ چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیتا اور وہ سرد نگاہوں سے باپ کو تکتے ہوئے کہتی،

"میں اب کہاں جاؤں گی، یہیں پر مروں گی مگر تم اپنے ہاتھ میرے جسم سے دور رکھو مجھے گھن آتی ہے۔ تم چھوتے ہو تو میرے جسم پر سانپ رینگنے لگتے ہیں خدارا! مجھے قبر کے اس عذاب سے دور رکھو۔ مجھے اپنے آپ سے، اپنے بستر سے دور رکھو۔ مجھے دوبارہ زندہ ہو لینے دو، شائد میں کبھی تمھارے کام آ سکوں، مگر ابھی نہیں۔۔ ہٹو پیچھے۔۔ وہ اسے دھتکار دیتی۔۔۔"

اور بچے کو سمجھ نہیں آ رہا کہ ماں نے اس خوابوں کے محل پر پھونک مار کر اسے سویا ہوا محل بنا دیا ہے یا باپ نے؟ جب وہ چھ سال کا تھا تو باپ اس کی ماں سے کہا کرتا تھا اس بچے کے سوال مجھے خوفزدہ کر دیتے ہیں اور آج جب وہ سولہ سال کا ہے تو اپنے سوالوں سے خود خوفزدہ ہے۔ وہ خود سے اور دنیا سے چھپتا پھرتا ہے۔ وہ بچپن میں کبھی بے بی ٹاک نہیں کرتا تھا۔ اب وہ دو بالغ بچوں کو آپس میں چور سپاہی کا کھیل کھیلتے دیکھ دیکھ ہکلانے لگ گیا ہے۔ جملے اس کے منہ سے نکلنے سے پہلے اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ نشے کے ذریعے بچپن کی دیوار پر مکھی بن کر چپک گیا ہے۔ وہاں اسے وہی بچپن کے خواب اور وہی محبت نظر آتی ہے۔

ماں باپ کو جب پتہ چلا کہ وہ نشہ کرنے لگ گیا ہے تو انہوں نے پورا ایک گھنٹہ اس فکر میں گذارا۔۔اور پھر اپنی اپنی جنگ کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ وہ ان کی منت کرتا ہے؛

"ایک دفعہ، بس ماں ایک دفعہ وہ خواب سنا دو جنہیں سن کے میں بچپن میں اکتا جاتا تھا، ابا بس ایک دفعہ محبت میں ناانصافیوں کی کوئی دکھی سی اپنی کہانی سنا دو جنہیں سن کے میں چڑ جاتا تھا اور کہتا تھا ابا کیا آپ کی کہانیوں کی کتاب میں کوئی ہنسنے والی کہانی ہے؟ ابا اماں، میں وعدہ کرتا ہوں اب آپ کے خوابوں اور محبتوں کی کہانیوں سے کبھی نہیں اکتاؤں گا ۔"

ماں باپ غصے سے اکٹھے دھاڑتے ہیں؛

"خدا کا واسطہ ہے بڑے ہو جاؤ، خود مختار ہو جاؤ، ہم تمھارے لئے ایک دوسرے کو برداشت کرتے کرتے تھک گئے ہیں، جاؤ اور اپنا سہارا خود بنو۔۔ہمیں خود سے آزاد کردو۔"

وہ اور ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک نشہ ہی ہے جو اسے یہ سب سہنے کی طاقت دیتا ہے، وہ خود کو اس میں اور غرق کر لیتا ہے۔

بچہ، باپ کو اسی جگہ کھڑے ماں کا انتظار کرتے دیکھتا تھا تو مطمئن رہتا تھا کہ شکر ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک تو اپنی جگہ پر کھڑا ہے۔ وہ باپ کو دیکھتا تو سوچتا تھا کہ وہ باپ کے لئے نشے کو چھوڑ دے گا۔ اس کا باپ شائد زندگی پر اعتبار کا آخری سہارا تھا مگر یک دن وہ بھی اپنی جگہ سے سرک گیا اور بچہ زمین پر اوندھے منہ آ گرا۔

جب باپ ماں کو نئی گرل فرینڈ کا بتاتے ہوئے کہہ رہا تھا:

میں نے تمھیں واپس بلانے کی ہر ممکن کوشش کر لی، میں بھی انسان ہوں اور چاہے جانے اور کسی کو چاہنے کا فطری حق رکھتا ہوں۔ لو بیٹھو تم اب یہیں پر، اپنے جسم کو سنبھال کر۔

اب کوئی سانپ تم پر نہیں رینگے گا، میں نے ایک لڑکی سے دوستی کر لی ہے۔"

کیسا سچا اور غیر منافق گھرانہ تھا، سچائی اس گھر میں ناچتی پھرتی تھی اور انصاف کی لڑائی لڑی جا چکی تھی اور شائد دونوں لشکر ایک دوسرے کو برباد کر چکے تھے۔ یہ پہلی لڑائی تھی جس میں کوئی جیت نہیں تھی فقط ہار ہی ہار تھی۔

بچے نے اپنے تئیں جائزہ لینا چاہا کہ دونوں میں سے کون سا لشکر زیادہ برباد ہے؟ دونوں میں سے کون زیادہ سچا ہے؟ منافق دونوں ہی نہیں تھے، جھوٹا بھی کوئی نہیں تھا، انصاف بھی ہو چکا تھا۔۔اس کا سر چکرانے لگا۔ موت ایک دم حسین لگنے لگی۔ سارے خواب اور محبت کا انصاف۔۔زندگی کی سچائی اور رنگ۔ یہ ہوتا ہے سچ؟ یہ ہوتی ہے محبت؟ اور یہ ہیں زندگی کے خواب اور انکے رنگ۔ ان سب سے اچھی تو موت ہے۔ ان سب سے سچی تو موت ہے۔۔۔۔سوچتے سوچتے وہ بس ہر ایک کا منہ تکتا رہتا۔

نفسیاتی مریضوں کے ہسپتال میں، ماں باپ جھنجلائے بیٹھے ہیں، اپنے اپنے سچ کے ساتھ، دونوں کے گلے میں سچ کی مالائیں ہیں، اب جھوٹا صرف وہ بچہ ہے؛

وہ دکھی نظروں کے ساتھ یک زبان ہو کر ڈاکٹر سے کہہ رہے ہیں" ہم بھی کتنے بدنصیب ہیں ایک ہی بچہ ہے او وہ بھی نشہ کرنے لگ گیا۔ حد تو یہ کہ خودکشی کی کوشش کر لی۔ موت کو سچ اور زندگی کو جھوٹ سمجھ لیا ۔"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں ماں باپ کے لئے ہمدردی ہے اور وہ بچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے؛

" یکھو! یہ ماں باپ چھوٹے سے بچے کو ہزاروں قربانیوں کے بعد پال پوس کر اس لئے بڑا نہیں کرتے کہ تم ان کی دی ہوئی زندگی کو نشے اور موت میں غرق کر دو۔ یہ زندگی

صرف تمھاری نہیں ہے اگر اپنے لئے جینے کو دل نہیں کرتا تو بھی ینگ مین ان کے لئے جینا پڑے گا۔۔۔"

ماں نے خود پر ترس کھاتے ہوئے فوراً سوچا:

"میں نے اس کے لئے کتنی قربانیاں دیں، اپنے آپ کو مار کے ایک بے ایمان جھوٹے انسان کے ساتھ زندگی گزارتی رہی۔"

باپ نے روتے ہوئے خود کلامی کی؛

"اس بچے کے لئے تو سب ذلت برداشت کی، بے غیرت بن کر چپکا بیٹھا رہا۔ اپنے نفس کو اور عزتِ نفس دونوں کو مار کر اس بچے کی خوشی کے لئے اس رزیل اور خود غرض عورت کے ساتھ رہتا رہا۔ اور دیکھو ذرا اس بچے نے کیا کیا؟ نشے سے خود کو تباہ کر لیا میں نے جو دنیا اس کے قدموں میں جھکائی تھی، یہ کسی ہارے ہوئے انسان کی طرح ابھی سے زندگی کی بازی ہارنے نکل کھڑا ہوا ہے۔۔اتنا کمزور نکلا میرا بچہ"۔

بچہ موت سے بچ جانے کے بعد ماں باپ کے چہرے پر پھیلے ہوئے دُکھ کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہا ہے اور اس کا دل کر رہا ہے یہ دونوں اتنا روئیں، اتنا روئیں کہ ان کے چہرے کے نقوش مسخ ہو جائیں۔ وہ انہیں بتانا چاہتا ہے کہ میری کہانیوں کی کتاب سولہ سال کی عمر میں ہی تیار ہو گئی ہے۔ وہ باپ کو اس کا ٹوٹا ہوا وعدہ اور بکھرا ہوا عزم یاد دلانا چاہتا ہے کہ بچے کی کہانیوں کی کتاب میں کوئی دکھ نہیں ہوگا، بچہ اسے یہ اذیت ناک خبر پہنچا کر خوش ہونا چاہتا ہے کہ بچے کی کہانیوں کی کتاب میں سوائے دکھوں کے اور کچھ نہیں ہے اور اس کے خاندان کی اس کڑی سے بھی بدنصیبی غائب نہیں ہوئی، وہ باپ کو بتانا چاہتا ہے کہ اس کا لشکر اپنے خاندان کی محرومیوں کو کبھی ختم نہیں کر سکتا، اس کا لشکر ہار گیا ہے اور پھر اس کے

بعد وہ ان سب شکستوں کا سوگ باپ کے چہرے پر دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ سچ بتا کر ہی اسے تسکین ملے گی۔لڑائی سچ ہی کی ہے تو اس کا سچ بھی سنا جائے۔۔

وہ اپنی ماں کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ نسلوں اور صدیوں کا سفر طے کر کے اس کی آنکھوں میں آ کر بسنے والے، ماں کے خاندان کی میراث، وہ سب خواب جل چکے ہیں۔ ماں کے باپ نے جو جگنو اور تتلیاں، اسے سونپی تھیں اور ماں نے بچپن میں اس کی آنکھوں میں بھری تھیں سب مر گئی ہیں اور اب ہر طرف ان کی راکھ اڑ رہی ہے۔خوابوں کی موت کی خبر سنا کر وہ اس لشکر کی ہار کی خبر دے کر ماں کے چہرے پر پھیلے دکھ سے خوشی لینا چاہتا ہے۔ ماں بھی تو لے سچ کے مزے"

ہاہاہا!!!! اس کی کہانیوں کی کتاب میں ہنسنے کے لئے صرف یہی مواد مہیا ہے۔ ہاہاہا!!!

ڈاکٹر نے خوشی سے ماں باپ کو تکتے ہوئے کہا" مبارک ہو بچہ زندگی کی طرف لوٹ رہا ہے، آپکا بچہ مسکرا رہا ہے، شائد اسے جینے کا کوئی جواز نظر آ رہا ہے"۔

اپنے آنگن کے اجنبی

میرے بچے !! آج تجھے فرصت ہے؟ آج سوچا تجھ سے جی بھر کر اپنے دل کی باتیں کروں۔ جیسے ہی تیرے ابا دنیا سے گئے مجھ سے بات کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ تنہائی نے مجھے سہما دیا تھا اور جب تم لوگوں کے پَروں میں جان آ گئی، دانہ چوگنا خود سیکھ لیا اور اُڑ گئے تو میں اور سہم گئی، کونے میں دُبک کے بیٹھ گئی۔ یہ نہیں کہ تم لوگ اپنی اپنی بولیاں بولنے لگ گئے تھے یا اپنی اپنی اُڑانیں بھرنیں لگ گئے تھے بلکہ اس لئے کہ میں اپنی بولی بھول چکی تھی اور میری اُڑان ختم ہو چکی تھی۔ اس لئے کونے میں سہم کے بیٹھ گئی، قسم سے تم لوگوں کی اُڑان دیکھ کے تو دل خوشی سے جھوم اُٹھتا تھا۔۔۔

یقین جانو مجھے خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب میرے سکڑنے کا عمل شروع ہو گیا اور کب میں اتنا سکڑ گئی کہ کسی کیڑے کی طرح دیوار سے چپک کے رہ گئی اور ایسی کمزور ہوئی ہوں کہ ابھی بھی میرے پاؤں پر ایک کیڑا چل رہا ہے مگر سکت نہیں اسے ہٹانے کی، اسی لئے تیری یاد آ گئی تُو پاس ہوتا تو تجھے اشارہ نہ بھی کرتی تو تو سمجھ جاتا۔ تُو ہے ہی بڑا پیارا بچہ، بڑا تابعدار۔۔ مگر پاس نہیں ہے نا، اُڑ گیا ہے۔ پاس رہتا تو میرے کہے بغیر میرا خیال کر لیتا۔۔۔ تُو اب صحن میں پڑی بے جان سی ماں کے پاس ہے نہیں نا۔۔

مجھ میں ہلنے کی طاقت بھی نہیں رہی۔ آنگن میں رکھی اس چار پائی پر لیٹے لیٹے ایسے ہی شاندار ماضی میں گم ہو جاتی ہوں۔ تم پاس سے گذرتے ہو تو آنکھیں بند کر لیتی ہوں، تم سمجھتے ہو، اماں سو رہی ہے۔ اور بس بغیر مجھے چھوئے آگے نکل جاتے ہو۔

میں اتنی سکڑ جاؤں گی اس کا مجھے کبھی گمان بھی نہیں ہوا تھا۔ کیسے گمان ہوتا میں تو اس گھر کی ملکہ تھی۔ تمھارا باپ جس دن مجھے یہاں، اسی آنگن میں بیاہ کر لایا تھا، اس دن سے اس نے مجھے ملکہ ہی بنا کر رکھا تھا۔ لوگ کہتے تھے تم گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہو کہاں کی مہارانی ہو؟ ان جاہلوں کو کون سمجھاتا اپنے گھر کے کام کرنے سے کوئی نوکرانی نہیں ہو جاتا، مہارانی ہی رہتا ہے۔ ہاں اگر تمھارے ابا مجھے دل کی رانی نہ بناتے، مجھے اپنی زندگی کا حصہ نہ بناتے، مجھے مان نہ دیتے، تو میں گھر کے کام کرنے والی ایک مہترانی ہی ہوتی، مہارانی نہیں۔ مگر اللہ انہیں جنتوں میں پیارا سا گھر دے، انہوں نے مجھے اپنی آخری سانس تک دل و جان سے مہارانی ہی سمجھا۔ وہ میری کوئی بات نہ ٹالتے تھے اور نہ ان کی زندگی تک کسی اور کو مجھ سے اختلاف کی اجازت تھی۔

جب تم بچے ہماری زندگیوں کا حصہ بن گئے تو تمھارے ابا نے میرے تاج میں اور بھی محبت، مان اور اعتماد کے نگینے جَڑ دیے۔ وہ کوئی کام مجھ سے پوچھے بغیر نہ کرتے تھے۔ کہتے تھے جان نکلنے کا ڈر نہ ہو تو سانس بھی تم سے پوچھ کے لوں۔۔ میں ایف۔اے پاس، ایک اعلیٰ سرکاری افسر کے اپنے اوپر ایسے انحصار پر پھولی نہ سماتی تھی۔ اعتماد سے بھر جاتی اور اپنے آپ کو ہلکی پھلکی پتنگ کی طرح ہواؤں میں اُڑتا محسوس کرتی۔ تم لوگوں کے کاموں میں بھاگی دوڑی پھرتی۔ نہ تھکاوٹ کا احساس ہوتا، نہ اپنے آرام کا خیال آتا۔

تمھیں یاد ہے نا؟ تم سب مل کے مجھے بہت ستاتے تھے۔ مگر پتہ نہیں کیا تھا کہ میں تنگ نہ ہوتی تھی۔ تمھارے ابا کا دیا اعتماد تو تھا ہی، تم لوگوں کو پروان چڑھانے کا ایک الگ ہی مامتا کا فخر تھا۔ جیسے کوئی مصور اپنی تصویروں میں رنگ بھرتا ہے، جیسے کوئی معمار گھر کی تعمیر ایک ایک اینٹ لگا کے کرتا ہے، جیسے کوئی مالی اپنے لگائے پھولوں کو کھلتا دیکھتا ہے، میرا شاہکار، میرا گھر اور میرے پھول تم لوگ تھے۔۔ تم سب، یہ گھر، سب کچھ میرا تھا، میں اس گھر کی پالن ہار یا ملکہ یا مہارانی جو بھی تھی بس بہت خوش تھی۔

تمھارے ابا مجھے تم لوگوں کے پیچھے سر دھڑ کی بازی لگائے بھاگتے دیکھتے تو کبھی بہت ہنستے تھے اور کبھی اُکتا سے جاتے تھے۔ کہتے تھے مُنے کی اماں، کبھی اپنے لئے بھی وقت نکال لیا کرو اور میں لگاوٹ سے کہتی تھی یہی میرے وقت کا بہترین استعمال ہے اور میں نے وقت کو سر پر مارنا ہے۔۔اللہ کی بندی اپنے لئے نہ سہی ہمارے لئے ہی کچھ وقت نکال لیا کرو، یعنی میرے اور تمھارے لئے، الگ سا کوئی سنبھالا ہوا وقت اور میں ان کی یہ بات سنی اَن سنی کر دیتی۔

تم لوگ میری عبادت تھے کوئی اپنی عبادت سے بھی بھلا تنگ آتا ہے؟ یہ عبادت کبھی مشقت نہ لگتی تھی بس اس چارپائی تک مکمل طور پر نڈھال ہو کر پہنچنے تک یہ عبادت عبادت ہی رہی۔ میری زندگی تم لوگوں سے شروع ہو کر تم لوگوں پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ اور تمھارے ابا کے سمجھانے پر بھی یہ بات میری سمجھ میں آتی ہی نہیں تھی کہ تم لوگوں سے پَرے بھی کوئی زندگی ہے؟ یہ بات آج بھی، جب کہ میں اس کونے میں سمٹی سکڑی پڑی ہوں، سمجھ میں نہیں آرہی، آج بھی تمھارے قدموں کی چاپ پر، تمھارا وقت مجھ سے باتوں میں ضائع نہ ہو، آنکھیں تو بند کر لیتی ہوں مگر دل اسی چاپ کا منتظر رہتا ہے۔ گھر کے بڑے دروازے سے تمھارے بیڈ روم تک تمھارے قدموں کی چاپ کے گرد ہی زندگی گھوم رہی ہے۔ آج بھی بند آنکھوں کے پیچھے سے تم سے ہی ہمکلام ہو۔ تمھارے ابا کی روح قبر میں اب بھی مجھ سے پوچھ رہی ہوگی۔۔اللہ کی بندی کیا آج بھی اپنے بیٹے سے ہی باتیں کرے گی؟

مُنے تو جانتا ہے نہ تیرے ابا بھی تجھے کتنا پیار کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے میری ساتویں حس مجھے بتاتی ہے کہ یہ لڑکا ہی بڑھاپے میں ہمارا سہارا بنے گا۔۔ میں ساتویں حس کا لفظ سن کے ہنس دیتی۔۔ چھٹی تک تو سنا ہے ساتویں کیا ہوتی ہے؟ مگر جو بھی ہوتی ہوگی ٹھیک ہی ثابت ہوئی، دیکھو، اجل نے انہیں تو موقع نہیں دیا کہ اپنی ساتویں حس کو سچ ہوتا دیکھ سکتے مگر میں تمھاے سہارے سے اپنے بڑھاپے سے مکمل طور پر لطف اندوز ہو رہی

ہوں، تمھارا دیا کھاتی ہوں، تمھارے گھر (جو کبھی ہمارا تھا) کے کونے میں پڑی ہوں۔ تمھارے ابا کی پیشن گوئی کتنی سچی تھی۔

جب ابھی اتنا نہ سکڑی تھی کہ چلنے سے ہی معذور ہوتی، تو ایسے ہی کبھی بے دھیانی میں تمھاری بیوی کی سہیلیوں کے سامنے آجاتی تھی تو ان کی آنکھوں میں اُلجھن دیکھ کر تمھاری ذہین بیوی جھٹ سے کہتی تھی، "بڑا فائدہ ہے ان کا، بچے جب چھوٹے تھے انہیں کہانیاں سناتی تھیں، ورنہ تو تم لوگوں کو پتہ بچے رات کو سونے سے پہلے کتنا تنگ کرتے ہیں، بھئی میرے شوہر تو مجھے مار ہی دیتے اگر رات کو میں بچوں کو سلانے کی کوشش میں نڈھال ہو کر ان کے پاس پہنچتی۔۔بڑا فائدہ دیا انہوں نے"۔۔

تمھارے ابا کی یاد آجاتی تھی جو کہتے تھے اللہ کی بندی ہمارے لیے کون سا وقت ہے؟ ان کے حصے تو میرا وقت کبھی نہ آیا مگر پھر وہ وقت تمھارے بچوں کو کہانیاں سنا کر دینے لگی۔ مگر ایک دن وہ وقت بھی بے وقعت ہو گیا جب تمھاری چھوٹی بیٹی نے کہا:

گرینی آپ کی کہانیاں بہت آؤٹ ڈیٹڈ ہوتی ہیں، مت سنایا کریں تو میرے بچے اُس دن تیرے ساتھ لگا میرا ایک اور ٹانکا ٹوٹ گیا اور میں مزید سکڑ گئی۔

پتہ نہیں کیا تھا تمھاری بیوی کو ہر دوسرے دن اپنی کسی نئی ملنے والی کو میرے وجود کا کوئی نہ کوئی فائدہ بتانا پڑ جاتا تھا، "یار بزرگوں کی بڑی برکت ہوتی ہے، ہم گھر پر نہ ہوں تو فون پر میسیج بھی لے لیتی ہیں"۔

اور مجھے بھی اپنی برکت بس اسی وقت نظر آتی ورنہ تو اس گھر میں ایک ہی آواز مجھے آنے لگ گئی تھی "اوہ اللہ آپ کیا کرتی ہیں؟ آپ کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، جب سمجھ نہیں آتا تو نہ بولا کریں۔ یہ آپ کا چھوٹے سے ریڈیو والا زمانہ نہیں ہے یہ کمپیوٹر دَور ہے، دنیا سکڑ کے اس کمپیوٹر میں آگئی ہے" اور میرے بیٹے میں ڈرائنگ روم میں دھرے اس ڈبے کو جسے وہ کمپیوٹر کہہ رہی تھی دیکھ کے میں مزید سکڑ گئی۔

بس تیری بیوی دنیا کی طرح مجھے بھی سکیڑنا چاہتی تھی، نیند کی گولیاں کھا کے سونے سے منع کیا تو غصے میں آ گئی۔۔" کیا کرتی ہیں اماں، توبہ!! آپ کے زمانے میں لوگ لسی پی کر سوئے رہتے تھے، آجکل لوگ بلیک کافی پیتے ہیں اور ساری ساری رات ان کا دماغ ورکنگ حالت میں رہتا ہے، اب ایسے ہی سویا جا سکتا ہے"۔ میں پھر اپنی کم علمی کی وجہ سے سہم کے پیچھے ہٹ جاتی۔

گھر میں اس کا کوئی ملنے والا آ جائے یا ہمارے رشتہ دار وہ مجھ تک کسی کو پہنچنے نہیں دیتی تھی۔ اور ایک وہ وقت تھا جب میں پانچ منٹ چپ کر کے کہیں پڑنے کو ترستی تھی، تم چاروں میرے پیچھے بلی کے بلونگڑوں کی طرح چیاؤں چیاؤں کرتے پھرتے تھے۔ ایک دن میرے سر میں بہت درد تھی اور پورے گھر میں ایک بھی ایسا کونہ نہیں تھا جہاں مجھے سکون سے تم لوگ علیحدگی میں ایک گھنٹہ بھی آرام کر لینے دیتے اس دن پہلی دفعہ میں نے تمھارے ابا کو کہا تھا

یہ لوگ کبھی چین نہیں لینے دیتے، مر بھی جاؤں گی تو اٹھا کے کوئی کام بتائیں گے۔۔

وہ بہت ہنسے تھے کہنے لگے" نیک بخت تو اس گھر کی رونق ہے، تو اس بات سے خوش ہوا کر کہ تیری سب کو ضرورت ہے، تیرے بغیر اس گھر کا پہیہ جام ہو جاتا ہے، تُو حرکت ہے اس گھر کی، تیرے دم سے رونق ہے، تیرے بغیر سب ادھورے"۔۔ میں یہی سننا چاہتی تھی، میرا اندر جھوم اٹھا، رونق، ضروت، حرکت۔۔ میں یہ سب تھی۔

مگر ایک دم کیا ہوا؟ کیسے میرا وجود بے رونقی میں ڈھل گیا؟ کیسے میری ضرورت کم ہوتے ہوتے اس چارپائی پر آ کر ختم ہو گئی؟ مجھ سے بات کرنا مجھ پر احسان کرنا کب سے ہو گیا؟ اور جب اس چارپائی پر ناکارہ پُرزے کی طرح پڑی ہوں تو گھر کا پہیہ اب تک جام کیوں نہیں ہوا؟

یہ نہ سوچ کہ میں کوئی گلہ کر رہی ہوں مجھے شائد یاد نہیں رہا۔۔ ہاں میں تو ابھی بھی

ناکارہ نہیں ہوں، ہاہا!! ہاں یاد آیا تیری بیوی اپنی دوستوں کو میری افادیت بتاتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ "بڑی بی بڑے کام کی ہیں، ہم گھر نہ ہوں تو خوب نگرانی کرتی ہیں"۔۔ مگر تمھاری بیوی کی دوستیں بہت تیز ہیں شائد بلیک کافی پی کر کمپیوٹر کے زمانے میں لوگ ایسے ہی ایک دوسرے کو نیچا دکھاتے ہیں، مگر وہ دوست تو بہت ہی کمینی نکلی تجھے پتہ ہے تیری بیوی کو نیچا دکھانے کو کیا کہتی ہے؟ تجھے کیسے پتہ ہوگا، تجھے پتہ چل جاتا تو تو اس کا منہ نہ توڑ دیتا۔۔
نامراد کہتی:

"ارے ساس رکھنے کی یہ کون سی وجہ بتا رہی ہو، یہ کام تو میرا کُتا زیادہ اچھے سے کرتا ہے"۔ تُف ہے اس پر، مگر تیری بیوی بھی شرمندہ سی ہو گئی۔ وہ سہیلیوں کو گھر میں میرے بے کار وجود کی کوئی ٹھوس دلیل نہ دے سکی تھی، اور کتا بازی لے گیا۔

میرے بیٹے یہ نہ سمجھنا کہ میں تم سے گلہ کر رہی ہوں، تمھاری بیوی کا احسان ہے مجھ پر کہ اس نے اتنی سبکی کے بعد بھی مجھے اسی گھر میں رہنے دیا ہے، یا تمھیں اسی گھر میں میرے پاس رہنے دیا۔ ورنہ دیکھو میرے باقی بچے تو ایسی ہی ذلتوں کے خوف سے اپنا دامن مجھ سے چھڑا چکے ہیں۔ تم بھی چھوڑ جاتے تو میں کیا کر سکتی تھی؟ یا تم مجھے اس گھر سے نکال دیتے تو میں کیا کر سکتی تھی؟ اسلئے بڑا احسان ہے تمھاری بیوی کا مجھ پر، نہیں کسی سے بات کرنے دیتی تو نہ سہی۔۔ نہیں میری بات سنتی تو نہ سہی۔۔۔

آج ایسے ہی ان بند آنکھوں کے پیچھے سے خیال آ رہا ہے کہ تم سے ڈھیر سی باتیں کروں۔۔ یاد ہے! تمھارے ابا کہا کرتے تھے کہ بھلی لوک یہ گھر تیرا ہے، یہاں پتہ بھی تیری مرضی کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ تُو ملکہ ہے اور میرا پہنایا ہوا یہ تاج تیرے سر سے کوئی نہیں اتار سکتا۔ مگر یہ کیا؟ وہ یہ وعدہ وفا نہ کر سکے، ساتھ چھوڑ گئے، ان کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی تاج دھڑام سے زمین پر آ پڑا۔ اور میری سلطنت پر رہا سہا باقی کا قبضہ اس دن ہو گیا جس دن تم تینوں کی دلہنیں بیاہ کر آئیں اور میری اپنی بیٹی رخصت ہو کر چلی گئی۔ میرے گھر کا

ایک رنگ تھا مگر اس پر اندر اور باہر سے اور طرح کے رنگ چڑھنے لگے۔ میں نے گھر کا اصل رنگ قائم رکھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔۔ میرے سکڑنے کے عمل کے ساتھ ساتھ رنگوں کا یہ کھیل بھی جاری رہا۔ اور آج جب میرا سکڑنے کا عمل بھی مکمل ہو چکا ہے اور میرا کوئی رنگ باقی نہیں بچا۔ اس گھر کو بدرنگا تو نہیں کہوں گی کیوں کہ اب یہ تمھاری بیوی اور بچوں کے رنگوں سے سجا ہوا ہے مگر سوچتی ہوں کیا تو کبھی پرانے رنگ تلاش کرنے میری چارپائی تک آئے گا؟

آج تمھارا نہیں نہیں! تمھاری بیوی کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ میں آج بھی اسی گھر میں ہوں جہاں میری ڈولی آئی تھی۔ اس گھر کی دیواروں پر تمھارے ابا کے ساتھ گذارے ہوئے دن، تم لوگوں کی بچپن کی کلکاریاں، شرارتیں، لڑکپن کی چاہتیں، جوانی کے خواب اور میری اپنی جوانی کے دن سب کے عکس ہیں، اب یہ سب سامان میں نے تکئے کے نیچے پوٹلی بنا کر رکھ چھوڑا ہے، اس امید کے ساتھ کبھی تو تُو یہ سامان لینے آئے گا مگر اب تمام دن پر لگا کے اُڑ گئے ہیں اب اگر تُو آیا بھی تو میرے ہاتھوں میں شائد اتنی بھی جان باقی نہیں کہ تکئے کے نیچے سے سامان یا دیوار پر بکھری ہوئی یادوں کو اُتار کر تیرے سپرد کر سکوں۔ تو میرے ساتھ میرے "ماضی کے دروازے" سے داخل نہیں ہونا چاہتا، مجھے اپنے اپنے "حال" میں ساتھ چلنے نہیں دیتا۔ گلہ نہیں کر رہی ہوں اللہ کا شکر ہے کہ تو نے مجھے اس گھر میں رہنے دیا جو کبھی میرا تھا، جس کی کبھی میں ملکہ تھی۔۔۔۔

یاد ہے اس گھر میں میرے بنائے ہوئے قانون چلتے تھے۔ تیرے ابا نے کہہ رکھا تھا" یہاں وہی ہوگا جو یہ کہے گی"۔ یہ قانون کتاب سمیت کب غائب ہو گیا کچھ خبر نہ ہوئی۔ کڑیاں ملانے لگوں تو شائد پہلی ضرب تب لگی تھی جب تیری بہن نے اپنی شادی کے بعد میری کسی نصیحت کے بدلے ٹِنک کے کہا تھا:

"اوہو اب تو بس کر دیں اماں، میرے سسرال میں یہ سب نہیں چلتا، وہ ماڈرن لوگ

ہیں۔ آپ نے ساری عمر ہمیں دبا کے رکھا اب تو سانس لینے دیں"۔ میں یہ سنتے ہی سکڑ گئی۔۔ اس کے بعد گھر سے میرا رنگ اترنے اور میرے سکڑنے کا عمل میری بے خبری میں تیزی سے جاری رہا۔

تیری ماں ہوں۔۔ جس تباہی کی خبر مجھے نہ ہو سکی تھی، اس کی خبر تجھے دینا چاہتی ہوں۔ سوچ ذرا میں جو ڈھٹائی سے جیئے جا رہی تھی، اتنی نڈھال اور بدحال کیوں ہو گئی ہوں؟ آج تیرے قدموں کی چاپ پاس سے گزر گئی تو حرفِ شکایت بند آنکھوں کے پیچھے آنسو بن کر کیوں رڑکنے لگا ہے؟ بتاتی ہوں۔۔۔ میں جب سے سمٹ کے بیٹھی ہوں میرا سارا جسم آنکھ بنا بیٹھا ہے اب صرف دیکھ سکتی ہوں، تیرا چہرہ دیکھتی ہوں جو اب بدرنگ اور برباد لگتا ہے۔ تیرا اکیلا پن دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں تو اس دنیا میں کیا کما رہا ہے؟ تیرے باپ کو تجھ پر بڑا مان تھا، کہتا تھا بڑا ذہین بڑا فرمانبردار سپوت ہے۔ میں بھی تیرے بڑے لاڈ اٹھاتی تھی، سب سے اچھی چیز تیرے لئے چھپا کر رکھ لیتی تھی۔ اپنی ذہانت کی وجہ سے تو محلے بھر اور خاندان والوں، سب سے پیار لیتا تھا۔ مگر یہ کیا؟ ایک دن میں نے سنا تیرا بیٹا تیرے ساتھ اس بات پر لڑ رہا تھا کہ تو نوکری چھوڑ دے اور بزنس کرے۔ وہ کہہ رہا تھا" پاپا آج کل کون نوکری کرتا ہے؟ پیسہ بنانے کے لئے اچھا بزنس ضروری ہے"۔ تو دھیرے سے بولا تھا" بیٹا ساری عمر نوکری کی ہے اب اس عمر میں کیا بزنس کروں گا"۔۔

"بس مجھے کچھ نہیں پتہ آپ ریٹائرمنٹ لیں اور بزنس شروع کریں، میرے سب دوستوں کے پاس نئی نئی گاڑیاں ہوتی ہیں اور میرے پاس سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل، سب برینڈڈ کپڑے پہنتے ہیں اور ماما ہمارے کپڑے خریدنے کے لئے یہاں بیٹھ کر سیلز کا انتظار کرتی ہیں۔ میری عزت کی آپ کو کوئی فکر نہیں جو اتنی گھٹیا نوکری کر رہے ہیں"؟

گھٹیا نوکری؟ تمھاری سہمی سہمی آواز جس میں اسی طرح حیرانی گھلی ہوئی تھی جس طرح میری آواز میں شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر گھلتی تھی۔ ابھی تم اپنے بچے کے اس حملے

سے پوری طرح سنبھلے نہیں تھے کہ تمھاری بیوی کی پاٹ دار آواز نے تمھیں لرزا دیا۔۔

" کیا بچوں کی ساتھ بحث میں پڑ جاتے ہو؟ ان کے لئے ہی ہم سب کچھ کر رہے ہیں تو انکی خوشی کا بھی تو دھیان رکھو، اپنی دقیانوسی باتیں چھوڑ دو، وہی کرو جو بچے کہتے ہیں۔ جوان اولاد کے منہ نہیں لگتے"۔

تیری بیوی کا جملہ دو دھاری تھا، ایک طرف تم کٹ گئے اور دوسری طرف اس کا بیٹا اپنی جوانی کی طاقت پر نازاں، باپ کو اور دبانے کے لئے تیار، ماں کے گلے میں بازو ڈال کر کھڑا ہو گیا اور تیری بیوی نے اُسے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو، "دیکھ میں تیرے ساتھ دوڑنے کے لئے تیز رفتار، تازہ دم ماں ہوں، چھوڑ اس ہلکان ہوتے بڑھے باپ کو۔۔ مجھے دیکھ میں کیسی تیز رفتار ہوں"۔

تُو بیٹے اور بیوی کی سازش کا شکار ہو گیا۔ اپنی جدت اور رفتار کے ساتھ ساتھ ان کے لئے اپنی محبت ثابت کرنے کو تو بزنس کی آگ میں کود گیا۔ جب تو ریٹائرمنٹ کے پیسے لے کر گھر آیا تھا تیرا بڑا جاندار استقبال ہوا تھا۔ سب نے تجھے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ مگر میں جہالت کی ماری ہلکے سے پکاری تھی۔۔

"بیٹا تو نے ساری عمر نوکری کی ہے، لگی بندھی روزی کو ٹھوکر نہ مار، بزنس کا تجھے کچھ تجربہ نہیں ہے"۔۔ تو نے بیوی بچوں کے خوشی سے دمکتے چہروں کو دیکھتے ہوئے مجھ پر قہر آلود نظر ڈالی تھی اور کہا تھا۔۔" خدا کے واسطے اماں خوش ہونا سیکھ لیں۔۔ وہ نہیں سیکھنا تو کسی اور کو خوش ہوتے دیکھ کر برداشت کرنا سیکھ لیں۔ اور آپ ان باتوں میں کیوں بولتی ہیں جن کا آپ کو پتہ ہی نہیں"۔۔ میں دُبک سی گئی۔۔ ہاں، مجھے تو کسی بات کا پتہ نہیں۔ مجھے تو یہ تک نہیں پتہ کہ خوشی کے موقعے پر صرف خوش ہونا ہوتا ہے۔ گھر میں بیٹا نوٹوں کی بوری لایا تھا، سب خوش تھے تو میں کس بات کا ماتم منا رہی تھی؟

تجھے تو اس بات کی بھی خبر نہیں کہ تیرا کام بہت عرصے سے اس گھر میں صرف رقم دینا رہ گیا ہے۔ تو چیک کاٹتا جاتا ہے، وہ خرچ کرتے جاتے ہیں۔ تیری بیوی اور تیرے بچے اس وقت تجھے ڈھونڈتے ہیں جب انہیں پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تو بھی میری طرح خوش ہو جاتا ہے کہ تو اس گھر کا مرکز، تیرے بغیر یہ گھر ادھورا۔۔۔۔ میں جو، اب سکڑی سمٹی ایک کونے میں دبکی بیٹھی ہوں انہی سب گلیوں سے ہوتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہوں۔ اپنی خبر نہیں ہو پائی تھی، مگر تیرا گھٹنا، سب نظر آ رہا ہے۔

تو بچپن سے ہی بھولا سا تھا آج بھی تجھے خبر نہ ہوئی جب تیری بیٹی کا رشتہ دیکھنے والے آئے۔ تیری ماں نے بیٹی اور اپنے جوان بیٹے سے مشورہ کیا، مشورہ کیا؟ ان کی آنکھیں پڑھیں اور ہاں کر دی۔ تو نے کچھ بولنا چاہا تو بیٹی نے تیرے گلے میں باہیں ڈال کر کہا" پاپا میں نے زندگی گذارنی ہے جب مجھے لڑکا پسند ہے تو آپ کو کیا پرابلم؟"۔۔ تم نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا وہ لاپرواہی سے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ تُو ہکلاتے ہوئے بولا "نہیں بیٹا مجھے کیا پرابلم؟ جس میں تم خوش" اور بیوی کے یاد کرائے ہوئے الفاظ دہرا دئے تھے۔۔"

آخر یہ سب محنت میں تم لوگوں کی خوشی کے لئے ہی تو کر رہا ہوں"۔۔۔ یہ کہتے ہوئے تُو نے کن اکھیوں سے میری طرف دیکھا تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ بزنس میں تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے تجھے گھاٹے پڑنے لگے۔ تیرا وجود تیرے گھر والوں کے لئے تیرا بنک اکاؤنٹ خالی ہوتے ہی، ناکارہ ہو گیا۔ دوسری طرف اب تیرے بچے، تیری بیوی سب کمانے لگ گئے۔ تمھاری جسامت ایک دم سے گھٹ گئی۔ میں جس مقام تک سالوں میں پہنچی تھی، تو دنوں میں وہاں پہنچ گیا۔

تمھاری بیوی جب کمانے لگ گئی تو جو تم دونوں کے درمیان ایک سرسری سا ضرورت کا

رشتہ تھا، وہ اور بھی برائے نام سا لگنے لگا۔ وہ جب اپنی ضرورت خود پوری کرنے لگ گئی تو اس نے تمھیں دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ اس جدت نے تمھیں کیا دیا؟ تمھیں اپنا کام کرنے کی آزادی، بیوی کو اپنا۔۔۔

بچے!!! اس آزادی سے تمھارا دم گھٹ نہیں جاتا؟

تمھیں یاد ہوگا میں اور تمھارے ابا کتنے فرسودہ اور کم عقل ہوتے تھے کہ کبھی ایک دوسرے سے ایک گھنٹے سے زیادہ ناراض نہیں رہ سکتے تھے۔ ہم نے ہمیشہ کھانا اکھٹے کھایا، اگر ناراضگی ہوئی ہوتی تو اس کے ختم ہونے تک ایک بھی نوالہ ہمارے حلق سے نہ اُترتا تھا۔

کتنی وہمی اور جاہل تھی میں کہ تمھارے ابا کام سے کبھی لیٹ ہوجاتے تھے تو میں دروازے کے اتنے چکر کاٹتی تھی کہ پورے محلے کو پتہ چل جاتا تھا کہ آج منے کے ابا لیٹ ہوگئے ہیں۔ اب تم لوگوں کی خودمختار زندگیاں دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کیا پتہ تمھارے ابا کا میری اس محبت میں دم ہی گھٹتا ہو؟

ایک دوسرے کو آزادی دینا، یہ تو میں نے تمھاری بیوی سے سیکھا۔ ایک دن میں اس سے تمھارا پوچھ بیٹھی، وہ ایسے چلائی لگا جیسے کسی نامحرم کا پوچھ بیٹھی ہوں۔

"مجھے کیا پتہ اماں وہ کہاں ہیں؟ میں کیا اسکی جاسوسی پر ہوں؟ یا اس کی چوکیدار ہوں؟
"

"نہیں بیٹا ایسے ہی"۔۔۔۔۔ میں شرمندہ ہو کے نکل آئی تھی۔۔

تم بھی دنیا جہاں سے بے خبر کمپیوٹر میں سر دیئے بیٹھے رہتے ہو، تمھیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بیوی تمھارے آس پاس نہیں ہے۔ تمھیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بچے تم سے کچھ پوچھ رہے ہیں یا نہیں۔۔۔

بچوں کے قد تم سے لمبے ہوگئے تو تم مزید سکڑ گئے مگر تمھاری بیوی اور بھی تگڑی ہوگئی۔

وہ اپنے آپ کو تم سے برتر ثابت کرنے کے لئے، بچوں کی پیاری ماں بننے کے لئے، بچوں کے رنگوں والے تالاب میں چھلانگ لگا چکی ہے۔ بچے اسے بتاتے ہیں تو وہ تمھیں ایسے بتاتی ہے جیسے بچے اس سے پوچھ رہے ہیں۔ بتانے اور پوچھنے کے فرق کو وہ تمھاری آنکھوں سے اوجھل رکھتی ہے۔ یہ نہیں کہ میں ساس ہوں تو اس کا مورنی کا ناچ آنکھوں میں چبھن پیدا کر رہا ہے میں ماں ہوں اس لئے یہ آزادی اور space کے نام پر تمھیں ایک لنگڑا رشتہ نبھاتے دیکھ کر کڑھتی ہوں اور تجھے خبر دینا چاہتی ہوں کہ تیرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

تم میاں بیوی کا آپس میں کوئی مان، کوئی حق کوئی محبت کچھ بھی نہیں بلکہ صرف انڈر سٹینڈنگ، اور آزادی۔ میں تمھارے ابا کو کسی عورت کے ساتھ بات کرتے بھی دیکھ لیتی تو آگ بگولہ ہوجاتی تھی یہ تم لوگوں کی ڈکشنری میں "قید" ہے تو یقین مان تیرے ابا اس "قید" میں بہت خوش رہتے تھے مگر تو ایسی قید کی لذت سے محروم ہے۔۔ تیری بیوی کے سامنے ایسا کچھ ہوجائے تو کہتی ہے" میں کیا کروں، میں بھی تو آدمیوں سے بات کرتی ہوں اماں ہماری آپس میں انڈرسٹینڈنگ ہے"۔۔۔ اسے نہیں پتہ یہ چیزیں ناپ تول اور حساب کتاب یا ادلے بدلے سے نہیں ہوتی ہیں۔۔ یہ تو بس بیویوں کا حق ہوتا ہے، ان کے مرد پیار سے انہیں یہ حق دیتے ہیں۔

میری زندگی میں ان کی ذات کے علاوہ کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ میری ذات کا محور تھے۔ کسی دن میں تیرے ابا کی کسی چیز میں دلچسپی نہ لیتی تھی تو وہ پھیکے پڑ جاتے تھے۔ اور اگر تیری بیوی جتنی آزادی میں انہیں دے دیتی تو وہ تو مر ہی جاتے۔۔ اور تیری بیوی والی آزادی مجھے ملتی تو میں کتنے دن جی پاتی؟

تم دونوں اس ماڈرن رشتے کی وجہ سے زندگی میں ساتھ ساتھ بھاگ تو رہے ہو مگر تم دونوں کا کہیں ملاپ نہیں ہے۔ اس غیر فطری رشتے نے بچوں کو بھی سرد مہری دے دی ہے۔

تیری بیوی ان کے آگے پیچھے بھاگتی رہتی ہے سمجھتی ہے دنیا میں جینے کا یہی طریقہ ہے۔

تو ایک "پیارا سا پاپا" اور "انڈرسٹینڈنگ شوہر" بن کر رہ گیا ہے۔ تیرا نام تعارف کے لئے استعمال ہوتا ہے اور تو سر جھکائے نجانے کمپیوٹر میں کیا ڈھونڈتا رہتا ہے؟ تو ان القابات سے خوش کیوں نہیں ہوتا؟ بلاوجہ سینہ پھلانے کی کوشش کیوں کرتا ہے؟ تمھیں ایسا کرتے دیکھ کے مجھے تم پر ترس آنے لگتا ہے اور میرا سینہ پھٹنے لگتا ہے۔

تو سمجھتا ہے ماں اپنے رونے رو رہی ہے۔۔نہیں! میرے بیٹے میں تو ان بند آنکھوں کے پیچھے سے تجھے اپنی جگہ آتا دیکھ رہی ہوں اور تم کو تمھاری جگہ پر اجنبی ہوتا دیکھ رہی ہوں
۔

تمھیں وہ دن یاد ہیں جب ہم اس آنگن کے باشندے تھے، اپنی موج میں بہتے تھے۔ بڑی تازہ ہوا آتی تھی۔ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے اور کھلکھلاتے تھے۔ اس آنگن میں کتنے ہی پودے ہم نے مل کے لگائے تھے۔ ہمارے اوپر سورج بہت نرمی سے چمکتا تھا، جھلساتا نہیں تھا۔ کتنے پرندوں کو ہم نے اس آنگن میں باجرہ ڈالا تھا، اب وہ درخت پر آکر بیٹھتے ہیں اور ناراض ناراض سے مجھے تکتے ہیں۔۔وہ سمجھتے ہیں میں ان کو بھول گئی، میں ان کو کیسے بتاؤں کہ جاؤ اس آنگن میں پلٹ پلٹ کر نہ آیا کرو۔ یہ آزادی کا زمانہ ہے، تم بھی space لو۔ انہیں آزادی کیوں نہ دیتی اب اس گھر میں یہی رواج چل رہا ہے۔

میرے جانے کے بعد کبھی تم یہاں بیٹھے ہو اور وہ تم سے یہی سوال کریں تو انہیں بتا دینا۔۔ماں تمھیں نہیں بھولی تھی، بس اتنا سکڑی کہ اپنے آپ کو ہی بھول گئی تھی ماں تمھاری آزادی کو انڈرسٹینڈ کرنے لگ گئی تھی۔۔بس چپکے سے انہیں بتا دینا، مجھ سے تو ناراض ہیں، میری بات نہیں سنتے۔

کل تم آنگن میں میری لگائی ہوئی بیری کے نیچے سر جھکائے بیٹھے تھے، خدا کی قسم تمھیں پہچان ہی نہیں پائی، یوں لگا کوئی اجنبی بیٹھا ہے، غور سے دیکھا تو پتہ چلا اجنبی تو تم ہی ہو گئے ہو، بالکل میرے جیسے۔

مگر ابھی میں زندہ ہوں ابھی میرے سامنے میرے جیسی شکل لے کر مت آیا کرو۔ اب تمھاری چاپ پاس سے گزرتی ہے تو اس لئے آنکھیں نہیں بند کرتی کہ تمھارا وقت نہ ضائع ہو بلکہ اس لئے آنکھیں موند لیتی ہوں کہ تمھاری یہ شکل نہیں دیکھ پاتی۔ اس گھر میں تمھارے ابا کی آواز آج بھی میں سن سکتی ہوں۔ تم لوگوں کی چہکاریں ابھی بھی کانوں میں گونجتی ہیں۔۔

میرے پاس اس آنگن میں اجنبی نہ ہونے کے بہت سے بہانے میری ممتا کے آنچل میں چھپے ہوئے ہیں مگر پھر بھی مجھے اجنبی ہونے سے کوئی چیز نہیں بچا سکی۔

تو میرا بڑا پیارا فرمانبردار بچہ ہے۔ بس میرا ایک آخری مان رکھ لینا میرے جانے کا انتظار کر لینا۔ اس سے پہلے میری طرح اس گھر کا کوئی کونہ آباد نہ کرنا ٹھہر جانا ذرا، رُک جانا۔۔میری موت سے پہلے مجھے یہ موت کا منظر نہ دکھانا۔

یہ آنکھیں بہت کچھ سہ سکتی ہیں مگر یہ نہیں۔ اس آنگن میں ایک اجنبی کے ہوتے ہوئے دوسرے اجنبی کو کونے کے خالی ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔۔بول مان لے گا یہ بات؟ یا پھر سے کہہ دے گا اماں تُو چپ کر تجھے کچھ پتہ نہیں چلتا؟

موت کے بعد رہ جانے والا گھر

میز کے اوپر دھرا خالی گلاس جو اُس کروشیئے کے رومال سے ڈھکا ہوا ہے جس کے دھاگوں میں مرنے والی کے ہاتھوں کے نشان ابھی بھی پائے جاتے ہیں۔ کچھ دن پہلے تک باورچی خانے میں وہ کھڑی ہو کے کھانے میں چمچ ہلاتے ہوئے اپنے ان خوابوں کو سوچتی تھی جن کی تکمیل کی خاطر اس کے پورے وجود میں غصہ بھر گیا تھا۔ اُن خوابوں کے آنکھوں میں ٹوٹنے کا غصہ اور زندگی میں ملنے والے چھوٹے چھوٹے دھوکوں کا بوجھ باورچی خانے کے برتنوں سے اس کے جنازے کے چلے جانے کے بعد بھی جھانک رہا تھا۔ یہیں کھڑے کھڑے اس نے زندگی کے جتنے پل مر مر کے گذارے تھے وہ سب لمحات ابھی تک کسی آسیب کی طرح دیواروں سے چمٹے ہوئے تھے، اور پیچھے رہ جانے والے گھر کے افراد کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے ڈال رہے تھے۔

وہ انہی دیواروں کو تکتے ہوئے سوچا کرتی تھی کہ کیسے یہ گھر دنیا میں سب سے پیارا گھر بنے گا؟۔ دیواروں پر ہوئے پینٹ میں ابھی تک اس کی محنت کے پسینے کی بُو آ رہی تھی۔ فرش پر بچھے قالین نے اس کے جانے کے بعد وہ سارے بے آواز آنسو اُگلنے شروع کر دئے تھے جو وہ یہاں بہاتی رہتی تھی، کسی کو وہ آنسو نظر بھی آجاتے تو سنائی نہ دیتے تھے۔ اس قالین نے اس کے جانے کے بعد راز اگلنے شروع کر دئے تھے۔ باتھ روم سے وہ سسکیاں سنائی دینے لگ گئیں جو وہ وہیں ٹوتھ برش اور پیسٹ میں چپکی ہوئی تھیں۔

مرحومہ کے کپڑوں کی الماری کھولی گئی تو اندر سے تبدیلیوں کے وہ تمام مراحل برآمد ہونے لگے جو اس کے وجود نے جوانی کے ان تمام سالوں میں طے کئے تھے۔ زندگی کے جوش کو کم کرنے کے لئے جس دور میں وہ کالا سوٹ پہنتی تھی، وہ دور الماری میں ہینگر پر لٹک رہا تھا اور اس کے اوپر سنہری نگوں کا کام تھا۔ یہ زندگی کا وہ دور تھا، جب محبتوں پر اور رشتوں پر مرنے والی کو یقین تھا۔ وہ کہنے والوں کی باتوں پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتی تھی اور زندگی کو مٹھی میں پکڑ کر جوش سے چلاتی تھی "ہم سا ہو تو سامنے آئے" اور اس کے جوش اور دبدبے کے سامنے کوئی نہیں ٹھہرتا تھا۔

اِس گھر کی تعمیر کے لئے جو اب اُس کے مرنے کے بعد اکیلا رہ گیا ہے، اس نے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے تھے۔ وہ تنہا مزدوروں سے کھڑے ہو کے کام کرواتی تھی اور جب انہوں نے اس گھر کی بنیادیں رکھیں تو وہ غلطی سے اینٹیں رکھتے ہوئے اس کے خواب نکالنے بھول گئے۔ جیسے جیسے اینٹوں کی دیوار اونچی ہوتی گئی، خواب گہرائی میں اترتے گئے۔ ان کے اوپر بہت سا گارا، بہت سی مٹی اور بہت سا سیمنٹ آ گیا۔ اسے نہیں پتہ تھا خوابوں کا بہت سی مٹی کے نیچے دب جانے کا مطلب آدھی موت ہوتا ہے۔ وہ گھبرانے والوں میں سے نہیں تھی۔ پرانے خواب نظروں سے اوجھل ہوئے تو اس نے انہیں یکسر فراموش کر کے نئے گھر کے ساتھ آنکھوں میں نئے خواب بننے شروع کر دئے۔

اب الماری میں سے اس کا سرخ جوڑوں والا دور برآمد ہوا، اس دور میں زندگی کی حقیقت اس پر کھل گئی تھی اور وہ رشتوں کی بناوٹ اور منافقت سے اوب گئی تھی۔ سچ کی تلاش سے تھک کر اندر سے مدھم ہو رہی تھی۔ اس مایوسی اور کرب کی چبھن نے جو چڑچڑاہٹ کا تحفہ دیا تو اُس نے اسے سرخ رنگ میں چھپا لیا۔ ہینگر میں لٹکے سرخ کپڑے رونے کے بعد اس کی آنکھوں کے لال ڈوروں کو عریاں کرنے لگ گئے۔

وہ اس گھر میں تھی تو الماری کا دروازہ بند رہتا تھا، اس کے مرنے کے بعد الماری ہر خاص و عام کے لئے کھل چکی تھی اور اس کے اندر لٹکے مختلف ادوار کے کپڑے اس کی ہستی کو لوگوں کے سامنے عریاں کر رہے تھے۔ وہ ڈھانپے رکھنے کی عادی تھی اس کے جاتے ہی سب دروازے کھل رہے تھے۔ اس کے آنسو جذب کئے قالین پر لوگ گندے پیروں سے آ جا رہے تھے۔ سرخ کپڑوں کی تپش افسوس کے لئے بیٹھنے والوں کو جھلسا رہی تھی۔ کوئی اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر آگ تو اندھی ہوتی ہے، نہ پتہ پوچھتی ہے نہ مقصد بس جدھر راہ بنے ادھر کو چل پڑتی ہے۔ اس کے کپڑوں سے اٹھنے والی اس کے گم شدہ خوابوں کی آگ لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ زندگی میں کھائے جانے والے دھوکے لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کر رہے تھے۔ ہر وقت امید کی باتیں کرنے والے لوگ بھی حیرانی سے اپنی آنکھوں میں اکٹھے ہونے والے مایوسی کے دھوئیں کو زور زور سے ہتھیلیوں سے رگڑ رہے تھے۔

کمرے میں پڑی مرحومہ کی کتابوں کی شیلف میں، ان تمام کتابوں پر کہیں سے کالی دھول آ کر چمٹی بیٹھی تھی۔ اس میں مرنے والی کی بچیوں کی کتابیں نہیں بلکہ اس کی اپنی تھیں اور وہ سب دھول زدہ کتابیں کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی آنکھوں میں جلن کے ساتھ ساتھ سوزش پیدا کر رہی تھیں۔ کتابوں کی شیلف سے اٹھنے والی دھول ان بند کتابوں سے خارج ہو رہی تھی، جسے کبھی مرنے والی یوں پڑھتی تھی جیسے انہیں پڑھنے کے بعد وہ دنیا میں ترقی اور کامیابی کی سیڑھیاں پلک جھپکتے ہی طے کر لے گی۔ ان کتابوں میں وہ دن بند تھے جب وہ کنواری لڑکی تھی اور کالج کی سیڑھیاں پھلانگتی اور سٹیج پر چڑھ کر کبھی تقریریں کیا کرتی اور کبھی گانے گایا کرتی تھی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ نرالا کرنے کی دھمک ابھی بھی کتابوں سے نکل رہی تھی۔ شور پیدا ہوا تو کمرے میں موجود لوگوں نے اپنی اپنی کتاب ایک دوسرے سے چھپالی، مگر مرنے والی چلی گئی تھی اس لئے اس کی کتابوں کا شور کسی سے نہ روکا

گیا۔ کمرہ آہوں اور سسکیوں سے گونجنے لگا، ماتم کی آوازیں دل کو دہلانے لگیں۔ کتابوں نے چپ نہ رہنے کی ٹھان رکھی تھی، وہ بولتی گئیں اور افسوس کرنے والے رو رو کے بدحال ہوتے گئے۔ اس کی کتابوں کے شیلف سے دھیان ہٹانے کو کچھ سمجھدار لوگوں نے اس کی بچیوں کی کتابوں کی شیلف کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ کتابیں ابھی نامکمل سی پڑی تھیں، ان میں خواب اِدھر اُدھر اُلٹے سیدھے پڑے ہوئے تھے۔ بچیوں کے قہقہے اور ننھی ننھی خوشیاں جو ماں کے ساتھ سے جڑی ہوئی تھیں بڑی لاپرواہی سے ان کتابوں سے جھانک رہی تھیں۔ یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی اور مرنے والی کی پیچھے رہ جانے والی بچیوں کی کتابوں کی شیلف سے نکلنے والی ہنسی بھی لوگوں کو ماتم کرنے پر مجبور کرنے لگی کیونکہ سب جانتے تھے کہ اب اس شیلف میں وقت سے پہلے ہی خوابوں کے ٹوٹنے اور چھوٹے چھوٹے دھوکوں سے نبٹنے کی کتابیں بھرنے والی ہیں۔ اس شیلف میں مرنے والی کے اپنے لئے نہیں، اپنی بچیوں کے لئے دیکھے گئے خوابوں کی کتاب بہت نمایاں نظر آ رہی تھی۔ وہ خواب جو اس نے اس گھر کی تعمیر کے ساتھ ہی دیکھ لئے تھے جب اس کے اپنے خواب گھر کی بنیادوں کے ساتھ بہت گہرائی میں اتر گئے تھے۔

کتابوں اور گلاسوں پر پائے جانے والے اس کی انگلیوں کے نشان اس کے مرنے کے بعد زیادہ گہرے ہو گئے ہیں۔ افسوس کے لئے آنے والے اس جواں سال موت کی وجہ سے جھلاہٹ کا شکار ہو کر اپنے اپنے خوابوں کو اپنے ناخنوں سے کھرچنے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ مرنے والی کو ناخنوں سے کسی بھی سطح کو کھرچنے سے بہت چڑ تھی اس لئے اس کی الماری میں لٹکے آخری دور کے سفید کپڑوں میں ہل چل ہو رہی ہے۔ مرنے سے ایک دو سال پہلے ہی اس کا پسندیدہ رنگ سفید ہو گیا تھا۔ کہاں سرخ اور کہاں سفید۔

ہینگر میں لٹکا سفید فراک جس کے کناروں پر چاندی رنگ کا ربن لگا ہوا ہے جو صرف چمکتا ہے تو نظر آتا ہے ورنہ تو بے جان سفید جیسا ہی ہے۔ مرنے والی کے سفید کفن

کے اوپر سرخ دوپٹہ ڈال دیا گیا تھا۔مگر اس کی الماری کے ہینگرز سے ابھی تک سفید لباس چمک رہا تھا۔ جو اس کے زندگی کے اس دور کا حال سنا رہا تھا جب اس کی مایوسی نے درویشی اوڑھ لی تھی ۔ جب اس نے لڑنا چھوڑ کر بس بات بے بات رونا شروع کر دیا تھا۔ جب وہ آخر کار سمجھ گئی تھی کہ نہ یہ دنیا اس کی مٹھی میں آسکتی ہے اور نہ یہ دنیا اسے اسی حالت میں اپنا سکتی ہے۔اس کا اور دنیا کا جو پہلے دن سے ٹکراؤ تھا،ختم ہو گیا تھا اور اس نے سفید رنگ پہن کر اس طاقتور دنیا کے آگے گھٹنے ٹیک دئے تھے۔اب اس کی آنکھیں غصے سے سرخ نہیں بلکہ سفید پڑ جاتی تھیں ۔ وہ سچ بات کہہ کے پریشان ہو جاتی تھی ، جیسے کوئی بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔اسے لگتا تھا اس کے سرخ رنگ کے دنوں کے جلال کا سب قصور ہے۔سفید رنگ اوڑھ کر اسے لگا جیسے صرف وہ قصور وار تھی۔اس کی آنکھوں میں جتنے بھی خواب ٹوٹے ، روح پر جتنے بھی چھوٹے بڑے دھوکے ٹھہرے، وہ سب اس کا اپنا ہی قصور تھا۔

سفید دور کی بُردباری اس کے لباس سے نکل کر اسکی پیچھے رہ جانے والی معصوم بیٹیوں کے چہروں پر چمک رہی تھی ۔ کیونکہ ان کی ماں زندگی کے ہینگر میں لٹکے کالے، لال سب دور زندگی میں ہی اپنے اندر اتار چکی تھی ۔سفید رنگ اوڑھ کر جب وہ قبر کی طرف جا رہی تھی تو موت کے بعد پیچھے رہ جانے والے تنہا گھر کی دیواروں کو بھی سمجھداری اور برداشت کا سفید رنگ اوڑھا گئی تھی ۔افسوس کے لئے آنے والوں کی رو رو کر جب آنکھیں سفید ہونے لگیں تو کسی نے الماری کے اندر سے جھانکتے سبز شادی کے جوڑے کو دیکھ لیا۔۔اور اس کے سفید کفن کے اوپر سرخ دوپٹہ ڈالنے پر اعتراض کرنے والے چپ کر کے ،مرحومہ کے سبز رنگ کے شادی کے جوڑے کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ جو دلہنیں ضد کر کے شادی والے دن سرخ جوڑا نہیں پہنتیں ، انہیں جلد ہی ، بڑھاپا آنے سے بہت پہلے ہی کفن کے اوپر سرخ دوپٹہ اوڑھنا پڑتا ہے۔

بدرنگ صوفہ

تم کون ہو؟

میں ؟ ۔۔میں نگہت ،کیا آپ مجھے نہیں جانتے ؟ ۔۔میں نے حیرت سے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھتے ہوئے سوال پر سوال کر دیا۔

نام تو میں جانتا ہوں اور بہت سے لوگ بھی جانتے ہونگے ،مگر جو تُم بھی نہیں جانتی اس کے جواب کی تلاش ہے۔

میری آنکھوں میں ابھی بھی حیرت تھی۔

سوچو، اسی حیرت سے سوچو، اسی تجسس سے سوچو،محنت سے سوچو، بُوجھو کہ تم کون ہو؟اس نام کے علاوہ کون ہو۔۔

میں جو اپنے آپ کو بہت زیادہ" جاننے والی" سمجھتی تھی ،اس انکشاف پر حیران رہ گئی کہ میں اپنے آپ کو ہی نہیں جانتی تھی۔

کینیڈا کے الیکشن میں کیا ہوگا ؟ امریکہ کے چھوٹے ممالک پر مظالم کی وجوہات کیا ہیں؟ پاکستان میں جمہوریت کیوں نہیں پنپتی ؟ تھرڈ ورلڈ ممالک کا المیہ کیا ہے؟ کیا سرمایہ دارانہ نظام نے دنیا کے امن کو چاٹ لیا ہے یا نظریوں نے انسان کو مات دے دی ہے؟ ان سب سوالوں کے جواب دینے میں ، مجھے سوچنے کو ایک پل بھی نہیں چاہیئے تھا،مگر میں کون ہوں؟ اس کا جواب اتنا مشکل ہوگا کہ میرا جسم ٹھنڈے پسینے سے بھیگ جائے گا اور میری

ہڈیوں میں زمانے بولنے لگ جائیں گے، یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔۔۔۔۔۔

یہ سوال آج بھی جواب کی تلاش میں میرے ساتھ اس کمرے میں لیٹا ہوا ہے، آج جب کہ میں گھر سے کوسوں دور ہوں اور سوچ رہی ہوں یہ اجنبی کمرہ جس کے اندر ایک اجنبی بیڈ پڑا ہے، اور سائیڈ پر ایک اجنبی صوفہ دھرا ہے۔ کیا ان سے کبھی کسی نے پوچھا ہوگا کہ تم کون ہو؟

لیمپ کی روشنی میرے چہرے پر پڑ رہی ہے اور میں آئینے میں دیکھتی ہوں کہ شائد، تم کون ہو؟ کا جواب وہیں کہیں دھرا ہو۔۔۔۔

آئینے سے جواب نہ ملا تو میں اُس بدرنگ صوفے پر جا بیٹھی، نجانے کیوں آئینے میں اپنے عکس سے اتنی انسیت محسوس نہیں ہوئی جتنی اس صوفے سے ہو رہی ہے۔

جانتی ہوں، اس پر میرا کوئی حق نہیں، کل ہوٹل کے اس کمرے میں کوئی اور آ کر ٹھہرا ہوگا اور یہ اسکے استعمال میں بھی ہنسی خوشی آتا ہوگا، اس نے کب کسی کو اچھا یا برا کہہ کر گلے سے لگایا یا دھتکارا ہوگا۔ جو کمرے کی قیمت ادا کرتا ہے اس، قیمت میں کچھ حصہ اس صوفے کا بھی ہوتا ہوگا، اسی قیمت کے بدلے کوئی بھی اس پر آ کر بیٹھ آ سکتا ہے، لیٹ سکتا ہے اور اپنے جسم سے نکلے تفریحی لمحات کے قطرے پھینک سکتا ہے۔ یہ کس کو روکتا ہے یا کس کو پاس بلاتا ہے۔ اس کا کون ہے، اسے سب ادھورا چھوڑ جاتے ہیں، اسے کون کہہ کر جاتا ہے کہ تمھارے بغیر اب رہنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کو آنے کے بعد اور جانے سے پہلے کون پوچھتا ہے کہ تمھارا حال کیا ہے؟

میں اس صوفے پر جس کا رنگ کبھی بڑا خوبصورت نیلا رہا ہوگا، بیٹھی ہوں۔ اپنے بچوں سے، اپنے اس گھر سے، جسے میں نے بڑی محنت سے بنایا تھا، کوسوں دور بیٹھی ہوں اور سوچ رہی ہوں کبھی میرا رنگ بھی بڑا پیارا نیلا تھا مگر اب اس صوفے کی طرح میرا رنگ

جگہ جگہ سے اتر چکا ہے۔ میں نے صوفے کو جھاڑا، ایک دم سے مجھ پر پڑی زمانوں کی دھول اڑنے لگی۔ صوفے کا مسخ شدہ چہرہ تو سب کو نظر آ رہا تھا، مگر روح میں اتری تھکاوٹ کسی کو نظر نہیں آتی تھی اور ہاں کوئی جھاڑ کے دیکھے تو دھول سے کمرہ بھرنے لگتا ہے۔ میں نے زور سے صوفے کو اپنے ساتھ بھینچ کر لگا لیا، یہ تو بالکل میرے جیسا ہے، میرے آئینے میں نظر آنے والے عکس سے بھی کہیں زیادہ میرے جیسا۔

کمرے میں اڑتی گرد میں مجھے نظر آیا جب میں بارہ سال کی تھی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ اپنے گھر کے صحن میں کھیل رہی تھی۔ اس صحن کے چاروں طرف کمرے تھے، سب کے دروازے صحن میں کھلتے تھے اور صحن کے منہ پر ایک دروازہ تھا جو باہر گلی میں کھلتا تھا، یہ دروازہ اکثر بند رہتا تھا، کھلا بھی ہوتا تو اس کے اوپر جھولتا ہوا لمبا ٹاٹ کا پردہ اس صحن کی دنیا کو دروازے کے دوسری طرف کھلنے والی دنیا سے الگ رکھتا تھا۔ سارے محلے کی لڑکیاں ہمارے صحن میں کئی سالوں سے کھیلنے آتی تھیں، اور اب سب بچپن کی سپاٹ اور لاپرواہ زندگی سے نوجوانی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اس سے پہلے ہم پردے کے دوسری طرف والی دنیا میں آزادنہ آ جا سکتی تھیں مگر اب جب کچھ اعضاء جسم سے الگ ہو کر ایک علیحدہ ہی منظر نامہ دکھانے لگے تھے، تو پردے سے اُدھر کی دنیا ہم سے دور ہو رہی تھی اور ایسے میں ہم لڑکیاں چونکنے کے مراحل میں داخل ہو چکی تھیں اور تجربہ کار عورتیں نصیحتوں اور عبرت کی کہانیوں کی پوٹلیاں اٹھائے ہمارے پیچھے پیچھے گھومتی رہتی تھیں۔

میرا اپنا جسم بھی کھل رہا تھا جو مجھے درد اور دوسروں کو راحت دینے لگا تھا، میں باہر جاتی تو ان آدمیوں کی نظریں کاٹنے لگی تھیں جن کی گودوں میں، مَیں نے کھیل کر بچپن گذرا تھا، اب وہ چھونے کی کوشش کرتے تو مجھے خود بخود شرمندگی ہونے لگتی تھی، مگر ان کے چہروں پر عجیب سی لذت کا رنگ ہوتا تھا۔ عجیب دن تھے نہ گھر کے اندر چین نہ باہر سکون، صحن کی دنیا